ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

تحریکِ استشراق

ماضی، حال، مستقبل

تالیف

کمال احمد علیمی نظامی
دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی، یوپی

ناشر
اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن
حیدرآباد، دکن

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ
[الصف:۸]

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

تحریک استشراق

- ماضی، حال، مستقبل -

مصنف:

کمال احمد علیمی نظامی

استاذ - دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی، یوپی

ناشر

اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن

حیدرآباد، دکن

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

بفیضِ روحانی شیخ الاسلام والمسلمین، رئیس المحققین، اشرف المرشدین

حضرت علامہ مولانا سید محمد مدنی اشرفی الجیلانی کچھوچھوی

سلسلۂ کتاب بزبان اردو: 114 ✿ سلسلۂ اشاعت بزبان اردو: 52

✿......نام کتاب : تحریک استشراق (ماضی، حال، مستقبل)

✿......مصنف : علامہ کمال احمد علیمی نظامی

[استاذ-دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی، یوپی]

✿......تقدیم وتعاون : علامہ سید علی علیمی علیگ

[پرنسپل نور جہاں عبد المصطفی انٹر کالج، بیدی پور، بستی، یوپی]

✿......کمپوزنگ : افتخار احمد علیمی: خان پرنٹرس، بستی۔

✿ تحریک واہتمام : محمد بشارت علی صدیقی اشرفی، جدہ، حجاز مقدس۔

✿......اشاعت اول : 1440ھ/2019ء (بموقع عرس مخدوم ملت محدث اعظم (قدس سرہ)

✿......ناشر : اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن، حیدر آباد، دکن۔

✿......صفحات : 224 ✿......ہدیہ:

✿ ملنے کے پتے ✿

☆......مکتبہ شیخ الاسلام، احمد آباد، گجرات۔ 09624221212

☆......سُنّی پبلی کیشنز، دریا گنج، دہلی۔ 09867934085

☆......اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن، حیدر آباد۔ 09502314649

☆......مکتبہ نور الاسلام، شاہ علی بنڈہ، حیدر آباد۔ 09966387400

☆......مکتبہ فیضان اشرفی، جامع اشرف، کچھوچھہ شریف۔ 09451619386

☆......عرشی کتاب گھر، میر عالم منڈی، حیدر آباد۔ 09440068759

☆......مدنی فاؤنڈیشن، ہبلی، کرناٹک۔ 08147678515

☆......مکتبہ سہروردیہ، گتی، اننت پور، آندھرا پردیش۔ 07013242112

انتساب

امام اعظم

ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی

غوث اعظم

سید محی الدین عبدالقادر جیلانی

ہم شبیہ غوث اعظم

سید علی حسین اشرفی جیلانی کچھوچھوی

مجدد اعظم

امام احمد رضا خان قادری بریلوی

محدث اعظم

سید محمد اشرفی جیلانی کچھوچھوی

سرکار کلاں

سید مختار اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی

شیخ الاسلام والمسلمین، رئیس المحققین، اشرف المرشدین

حضرت علامہ مولانا سید محمد مدنی اشرفی الجیلانی کچھوچھوی

مشمولات

صفحہ نمبر	عناوین	نمبر شمار
3-4	انتساب	1
5	ہدیہ تشکر	2
6	عرض ناشر	
8	تقریظ: ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی	3
14	تاثر جلیل: علامہ مفتی نسیم اشرف حبیبی، ڈربن، افریقہ	4
16	تقدیم: غلام سید علی علیمی	5
20	باب اول: تحریک استشراق	6
21	تعارف	7
26	استشراق، تبشیر اور استعمار کا واضح مفہوم	8
30	تحریک استشراق کا آغاز	9
36	تحریک استشراق کے چھ دور	10
36	دور اول	11
40	دوسرا دور	12
41	تیسرا دور	13
45	چوتھا دور	14
48	پانچواں دور	15
49	چھٹا دور	16
51	تاریخ استشراق: عہد بہ عہد	17

18	حاملین استشراق کی قسمیں	59
19	علم دوست مستشرقین	59
20	متعصب مستشرقین	62
21	پیشہ ور مستشرقین	65
22	ملحد مستشرقین	67
23	انصاف پسند مستشرقین	69
24	دولت ایمان سے سرفراز ہونے والے مستشرقین	70
25	اہداف ومقاصد	72
26	دینی مقاصد	72
27	علمی مقاصد	76
28	اقتصادی مقاصد	77
29	سیاسی مقاصد	78
30	مستشرقین کے علمی کارنامے	83
31	نادر مخطوطوں اور مسودوں کو جمع کرنا	84
32	نایاب اسلامی کتابوں کی نشرواشاعت	86
33	اہم اسلامی موضوعات پر کتابوں کی تصنیف وتالیف	88
34	باب دوم: قرآن کریم اور مستشرقین	93
35	قرآن کریم سے متعلق مستشرقین کے عام نظریات	94
36	قرآن کے کلام خداوندی ہونے پر اعتراضات	98
37	اختلاف قراءت پر اعتراضات	109
38	ناسخ ومنسوخ آیات پر اعتراضات	116
39	نسخ کا مفہوم	118
40	محل نسخ	119

41	زمانہ نسخ	119
42	شرائط نسخ	120
43	حکم نسخ	121
44	قرآن میں نسخ کی صورتیں	121
45	سابقہ شریعتوں میں نسخ کی مثالیں	122
46	تدوین قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات	124
47	عہد رسالت میں حفاظت قرآن کا اہتمام	127
48	عہد صدیقی میں کتابت قرآن	129
49	عہد عثمانی میں جمع قرآن	130
50	تدوین قرآن سے متعلق مستشرقین کے چند وسوسے	134
51	متفرق اعتراضات وشبہات	138
52	باب سوم: حدیث رسول اور مستشرقین	148
53	حدیث رسول اور مستشرقین	149
54	عہد رسالت میں حفاظت حدیث	155
55	عہد رسالت میں کتابت حدیث	157
56	عہد نبوی میں حفظ حدیث	160
57	عہد صحابہ میں کتابت حدیث	162
58	عہد صحابہ میں حفظ حدیث	164
59	عہد رسالت وعہد صحابہ میں عمل کے ذریعہ حفاظت حدیث	`166
60	عہد تابعین میں کتابت حدیث	171
61	حفظ حدیث اور تابعین	173
62	عہد تابعین کا ایک عظیم کارنامہ	174
63	کتب صحاح کی تدوین	176

64	روایت حدیث میں صحابہ اور ائمہ حدیث کا احتیاط	178
65	باب چہارم: سیرت نبوی اور مستشرقین	185
66	سیرت نبوی سے متعلق مستشرقین کے عام نظریات	186
67	خاندان رسالت اور مستشرقین	191
68	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ اور مستشرقین	200
69	تعارف مصنف: غلام سید علی علیمی	217

اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن،
حیدرآباد دکن

انتساب

ان دو مقدس ہستیوں کے نام....

جن کے صدقے مجھے جامۂ وجود ملا....

میری ہر سانس جن کا مرہونِ منت ہے....

میں جو بھی ہوں بس انھیں سے ہوں....

میرا جو بھی ہے سب انھیں کا ہے....

جن کی دعاے صبح گاہی اور نالہ شبی سے میں، میں ہوں....

جن کی خوشی، رب کی خوشی....

جن کی ذات رب کی نعمت....

جن کی مسکراہٹ زندگی کا حاصل....

جن کا دست شفقت سائبان رحمت....

اور جن کی رضا سرمایۂ آخرت ہے....

....یعنی....

میرے والدین کریمین

جو اس دنیا میں میرے لیے سب سے زیادہ اہم اور اکرم ہیں۔ رب رحیم ان کا سایۂ شفقت مجھ پر دراز فرمائے، میری عمر ان کو لگ جائے۔

کمال احمد علیمی نظامی

ہدیۂ تشکر و امتنان

بخدمت..............

حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی مصباحی، سابق صدر المدرسین دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی، جنھوں نے اس کام کی طرف توجہ دلائی اور قدم قدم پر رہنمائی بھی فرمائی۔

حضرت علامہ مفتی نسیم اشرف حبیبی صاحب ڈربن افریقہ جنھوں نے گراں قدر تقریظ لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

حضرت علامہ ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی، جنھوں نے اس کتاب پر تقدیم لکھ کر مفید مشوروں سے نوازا۔

میرے رفیق، میرے عزیز از جان دوست حضرت علامہ غلام سید علی علیمی، جو میرے سب سے اچھے ساتھی ہی نہیں میرے علمی سفر کے رہنما بھی ہیں، جن کے بغیر میں ادھورا ہوں۔

میرے محسن و کرم فرما عزت مآب محترم بشارت صدیقی اشرفی صاحب، حیدر آباد، دکن، جنھوں نے میرے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کیا، اور جو اکثر اس طرح کے کام کے لئے مجھے مہمیز کرتے رہتے ہیں۔

کمال احمد علیمی نظامی

7

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

تمام تعریفیں اللہ رب العزت کے لیے جو تمام جہانوں کا خالق و مالک ہے۔ بعد حمدِ خدائے تعالیٰ، بے شمار درود و سلام شاہِ لولاک، رسول پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر، ان کے اہلِ بیت پر، ان کے محبوب اصحاب پر اور ائمہ شریعت و طریقت پر۔

تحریک استغراق (ماضی، حال، مستقبل)۔ حضرت علامہ مولانا کمال احمد نظامی علیمی مدظلہ العالی [استاذ - دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی، یوپی] کی کمال تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب علامہ کمال احمد مدظلہ العالی کے زمانہ طالب علمی کی تصنیف ہے اور اعلیٰ علمی مباحث پر مشتمل ہے جس سے ان کی علمی صلاحیت اور قابلیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ علامہ کمال احمد مدظلہ العالی نے بڑے ہی دل کش اور عالمانہ انداز میں یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ موجودہ دور میں اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگاتے ہوئے میں نے چاہا کہ یہ کتاب برِّ صغیر کے اردو خواں اہل ذوق کی خدمت میں پیش کی جائے۔ میری اس خواہش اور اہم علمی و دینی ضرورت کے پیش نظر انہوں نے مجھے اس کتاب کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی جس کے لیے میں ان کا ممنون و مشکور ہوں۔

اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن نے اپنے اشاعتی منصوبوں کے تحت الحمد للہ! مختلف اہم عنوانات پر کتب و رسائل شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے؛ یہ کتاب **اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن** کی 52 ویں اشاعتی پیش کش ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب پاک صاحبِ لولاک ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے اس خدمت کو قبول فرمائے، ہر کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے، ناشرین وارا کین ''اشرفیہ اسلامک فناؤنڈیشن'' کو مزید دینی وعلمی خدمت کرنے کی توفیق نصیب فرمائے اور احباب اہل سنت کے لیے اس کتاب کو نفع وفیض بخش بنائے!

آمین بجاہ النبی الامین ﷺ!

فقیر غوثِ جیلاں وسمناں

محمد بشارت علی صدیقی اشرفی

جدہ شریف، حجاز مقدس۔

تقریظ

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی

کمال کے آدمی ہیں مولانا کمال احمد صاحب، قد میں چھوٹے، قدر میں بڑے ہیں کمال صاحب، ابھی وہ اپنی عمر کی سرحد کمال کو نہیں پہنچے ہیں، عمر ہوگی یہی کوئی ستائیس برس کے ادھر ہی، عمر کا یہ حصہ یا تو عشق و مستی کا ہوتا ہے یا سیکھنے سکھانے کا، لیکن کمال صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ اس کچی عمر میں پختگی کا مظاہرہ کرنے لگے ہیں، سادے رنگ، چھریرے بدن کے مالک مولانا کمال احمد صاحب دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی سے فارغ التحصیل ہیں، اس لئے وہ علیمی لکھتے ہیں، ان کی معراج کمال یہ ہے کہ تکمیل درس ہوتے ہی وہ علیمیہ کے استاذ مقرر کر لیے گئے ہیں، اردو، فارسی، عربی، علوم وادبیات میں گہری بصیرت کے عالم و فاضل ہیں، تحریر وقلم سے رشتہ کب استوار ہوا اس کا تو مجھے علم نہیں، البتہ جب وہ درجہ رابعہ میں تھے اس وقت کا ایک مضمون نظر سے گذرا، اندازہ ہوا کہ اسی کو کہتے ہیں:

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

یہ اسی برس کی بات ہے، غالباً جنوری کا مہینہ تھا، کمال صاحب نے کمال مہربانی سے فون کیا، پہلے تو انہوں نے میرے اسلوب نگارش کی تعریف کی، پھر حکم دیا کہ آپ مبلغ اسلام مولانا شاہ عبد العلیم میرٹھی پر ایک مضمون لکھ دیں، جو مارچ میں منعقد ہونے والے سیمینار میں پیش کیا جائے گا، میں نے کہا ہاں ٹھیک ہے، میرا موضوع ہی رضویات ہے یا

متعلقات رضویات، میرے کہنے پر انہوں نے کچھ مواد بھی بھیج دیا، مگر میں مضمون نہ لکھ سکا، نہ لکھنے کی وجہ میری ماں جی کی علالت تھی، پھر ۲۱ رفروری ۲۰۰۹ء کو ان کا وصال تھا، جب کمال صاحب کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے دردمندانہ تعزیت کی، انہوں نے میرا وعدہ مجھے یاد دلایا، مگر میں نے کہا ذہن قابو میں نہیں ہے، دل و دماغ اچاٹ ہے، ابھی ممکن نہیں پھر کبھی فرمائش کی تکمیل کردی جائے گی، ان سے یہ غائبانہ تعارف تھا، مزید تعارف کی صورت یہ ہوئی کہ دارالعلوم علیمیہ میں طلبہ کی تنظیم ''مجلس ثقافت ومعارف'' قائم ہے، ہر برس اس کے زیر اہتمام تحریری وتقریری مقابلہ ہوا کرتا ہے، جس میں باہر سے ایک یا دو خصوصی مہمان مدعو کئے جاتے ہیں، جو حکم یا فیصل کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

مولانا یٰس اختر مصباحی، مولانا عبد المبین نعمانی، مولانا اسید الحق، مولانا خوشتر نورانی وغیرہ، اس سے قبل اس پروگرام میں شرکت کر چکے ہیں، ہر چند کہ میں اس قابل نہیں، مگر کمال صاحب نے اس برس مجھے مدعو کیا، ممبئی سے بستی کا سفر دشوار گزار تھا، مگر ناچار اس راہ پڑا جانا، مجھے حاضر ہونا پڑا، یہ ۱۶ رمئی کی تاریخ تھی، شام کا وقت تھا، میں پہلی بار دارالعلوم علیمیہ حاضر ہوا تھا، مولانا کمال احمد صاحب سمیت تمام اساتذہ سے ملاقات ہو رہی تھی، علیمیہ کی در و دیوار دیکھ رہا تھا، اساتذہ کا اخلاق، طلبہ کی محبت، اس موقع سے مولانا کمال صاحب نے اپنی کتاب ''تحریک استشراق (ماضی، حال، مستقبل)'' کا مسودہ دکھایا، سرسری نظر ڈالا تو کتاب اچھی لگی، میں نے کہا اسے چھپوا دیں، انہوں نے فرمایا ہاں عنقریب چھپنے والی ہے۔

آج ۷ ررمضان ۲۹ راگست ہے، بہ نفس نفیس مولانا کمال صاحب ممبئی تشریف لائے ہیں، ساتھ میں کئی مسودات کا ایک پلندہ ہے، وہ مجھے ایک ایک کر کے دکھاتے جا رہے ہیں، میں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں، مسرور ہو رہا ہوں، رشک کر رہا ہوں، کبھی کبھی ان کا انداز اور کام دیکھ رہا ہوں، کبھی ان کی عمر اور عمل پر غور کر رہا ہوں، بالآخر میں کہہ دیتا ہوں مولانا آپ تو کام کی مشین معلوم ہوتے ہیں، واقعی آپ قابل رشک ہیں، خدا آپ کو سلامت رکھے۔

جب بات تمام ہوگئی تو کمال صاحب نے حکم دیا، ''تحریک استشراق

(ماضی، حال، مستقبل)'' پر کچھ لکھئے، عرض کیا اس موضوع کا مجھے مطالعہ نہیں ہے، میں کیا لکھوں گا، مگر وہ نہ مانے، جب وہ نہ مانے تو میں مان گیا، مان لینا اچھی بات ہے، نہ ماننا اس سے اچھی بات ہے، مگر میں نہ ماننے پر اٹل نہ رہ سکا، کیونکہ اولوالعزم، باحوصلہ نوجوان میری کمزوری بھی ہیں اور مجبوری بھی، یہ میرا حال بھی ہیں مستقبل بھی، ان امیدگاہوں کو مسمار کیسے کروں، جوان تو جوان ہیں جو جماعت کی کوہان ہیں، میرے نہ کہنے سے وہ کوہان کج ہوجائے یہ مجھے گوارہ نہیں، مجھے اس موضوع کا مطالعہ نہیں، گرچہ میں اس میں کچھ اضافہ نہیں کرسکتا، لیکن نوجوان قلم کار نے جو داد تحقیق دی ہے اس کی داد تو دے ہی سکتا ہوں، فاضل محقق کی محنت کی تحسین تو کرہی سکتا ہوں، ہر وہ شخص جس کو اپنے نوجوان سے پیار ہوگا، بھلاوہ داد و تحسین سے نوازنے میں بخل کیوں کر کرے گا۔

گفتگو شروع کرتے ہیں ان کے مسودات سے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے، اور میری نظر سے گذار چکے تھے، میں سرسری دیکھ رہا تھا، بالاستیعاب مطالعہ نہیں کرسکا، لیکن سرسری نظر سے ہی ان کی بے لاگ محنت، ذوق تحقیق، انداز تحریر سے ہی اندازہ ہوگیا کہ کمال صاحب ایک کوہ کن، تپامار، جفاکش جوان رعنا ہیں، یقین نہ ہوتو آپ بھی اک نظر دیکھئے۔

۱- ''مبلغ اسلام اخبارات کے آئینے میں''

یہ رسالہ مبلغ اسلام حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم قادری میرٹھی کے بارے میں ہے، اس کتاب میں کمال صاحب نے ان تحریروں اور تراشوں کو جمع کیا ہے جو یا تو خود حضرت مبلغ اسلام کے قلم سے نکلی ہیں اور اس عہد کے اخباروں میں شائع ہوئی ہیں، یا پھر وہ تحریریں ہیں جو ان کی ذات وفکر سے متعلق ہیں، یہ تحریریں جو اردو میں بھی ہیں اور انگریزی میں بھی، قدیم اخبارات کی بوسیدہ فائلوں میں دفن تھیں، یہ کمال صاحب کا ہی جگر ہے جو ان دفینوں کو قید ترتیب میں لائے ہیں، ان تحریروں اور تراشوں سے حضرت مبلغ اسلام کی شخصیت وخدمت کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں، جب یہ کتاب چھپے گی تو ایک عالم مستفید ہوگا۔

۲- ''سمجھو اور سمجھاؤ''

کسی ہندو متعصب مصنف نے کتاب لکھی تھی ''جاگو اور جگاؤ'' اس کتاب میں

کمال صاحب نے اس غیر مسلم مصنف کے تعصب کا پردہ چاک کیا ہے، اور حقیقت حال کے خدّ وخال بے غبار انداز میں پیش کیا ہے، یہ کتاب بھی تیار ہے جو چھپنے کے انتظار میں ہے۔

[الحمدللہ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ کمال احمد علیمی]

۳- "الخواطر العاطرۃ"

یہ کتاب عربی زبان میں ہے، یہ کوئی مستقل تالیف یا تصنیف نہیں، بلکہ عربی میں لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے، اس میں کوئی پندرہ سولہ مضامین ہیں، جوانہوں نے وقت اور حالات سے متأثر ہوکر لکھا ہے، اس میں ایک مضمون مظلوم فلسطین کے تعلق سے ہے، ایک مضمون امام احمد رضا کی مہارت حدیث کے بارے میں ہے، اس مضمون پر جب نظر پڑی تو ایک نئی جہت سمجھ میں آئی، وہ جہت ہے امام احمد رضا کی فتاویٰ رضویہ کی کس جلد میں کتنی حدیثیں بطور استدلال پیش کی گئی ہیں، یا ان کے کس رسالہ میں کتنی حدیثیں درج ہوئی ہیں، کمال احمد صاحب نے ان کی مجموعی تعداد بتائی ہے، جو کمال تحقیق وتلاش کا اعلیٰ نمونہ ہے، عربی ادب سے گوکہ مجھے شغف نہیں تاہم چند عبارتیں پڑھنے سے معلوم ہوا، کمال صاحب عربی زبان وادب میں بھی کمال ورک رکھتے ہیں، اس کتاب کو فوراً چھپ جانا چاہئے۔

۴- "عقائد اہل سنت پر اعتراضات۔ ایک جائزہ"

یہ ایک مقالہ ہے جو کتاب کا روپ دھارن کرلیا ہے، اس طویل مقالہ کا خلاصہ انہوں نے ابھی حال ہی میں مارہرہ شریف میں منعقد ایک سیمینار میں پڑھا تھا، مقالہ ایسا مدلل اور جدید حوالوں سے کسا ہوا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، اس علمی وتحقیقی مقالہ کا جو وزن ہے اس کا اعتراف ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم مارہروی جیسے محقق ونقاد نے کیا ہے، میں نے تو صرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، اور فہرست مراجع پر نظر پڑی تو حیران رہ گیا، اس مقالہ سے کمال صاحب کا کمال جوہر واضح ہوکر سامنے آجاتا ہے، اس مقالہ میں ہر اس اعتراض قدیم یا پھر جدید کا محقق متین سنجیدہ جواب دیا گیا ہے، جو عقائد اہل سنت پر وارد کیا گیا ہے، خدا کرے یہ کتاب جلد شائع ہوکر شائقین کے لیے سرمہ چشم بنے۔

۵- "تحریک استشراق (ماضی، حال، مستقبل)"

پیش نظر کتاب 180 / صفحات پر مشتمل ہے، فہرست ومراجع کامل دس صفحات پر

محیط ہے، مجموعی تعداد صفحات 224 رکھ سکتے ہیں، پوری کتاب ۳۳۵ رحوالہ جات سے مدلل ومنصوص ہے، فاضل محقق نے پوری کتاب میں چار مرکزی عنوان پر محنت کی ہے، ہر عنوان کے تحت ذیلی سرخیاں بھی قائم کی ہیں۔

پہلا عنوان: استشراق اور مستشرقین....

ہے، اس عنوان کے تحت درج ذیلی ضمنی سرخیاں ہیں:

☆استشراق۔

☆تبشیر اور استعمار کا واضح مفہوم۔

☆تحریک استشراق کا آغاز۔

☆تحریک استشراق کے چھ دور۔

☆دور اول، دور دوم، دور سوم، دور چہارم، دور پنجم، دور ششم۔

☆تحریک استشراق کی تاریخ عہد بہ عہد۔

☆حاملین استشراق کی قسمیں، اہداف ومقاصد، مستشرقین کے علمی کارنامے؛ اسلامی کتب بالخصوص قرآن کریم کا ترجمہ، اس کے کل صفحات پچپن ہیں، یہ پوری بحث ایک سوکتیس حوالوں سے کسی ہوئی ہے۔

دوسرا عنوان: قرآن کریم اور مستشرقین....

ہے، جو چھیالیس صفحوں پر محیط ہے، جس میں ایک سو چار دلیلیں پیش کی گئی ہیں، اس کی ذیلی سرخیاں یہ ہیں، قرآن کریم کی ناسخ ومنسوخ آیتوں پر اعتراضات، نسخ کا مفہوم، نسخ کا زمانہ، شرائط نسخ، حکم نسخ، ایک ہی شریعت میں ناسخ ومنسوخ کے چند نمونے، تدوین قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات، عہد رسالت میں حفاظت قرآن کریم کا اہتمام، مستشرقین کے وسوسے اوران کے جوابات، قرآن کریم پر متفرق اعتراضات اوران کے جوابات۔

تیسرا عنوان: حدیث رسول اور مستشرقین....

ہے، یہ عنوان ۲۴ رصفحات پر مشتمل ہے، جو ساٹھ دلیلوں اور شواہد سے مزین ہے، اس کی ضمنی سرخیاں درج ذیل ہیں:

عہد رسالت میں حفاظت حدیث، عہد رسالت میں کتابت حدیث، عہد نبوی میں

کتابت حدیث کے تعلق سے ایک شبہ کا ازالہ، عہد نبوی میں حفظ احادیث، عہد صحابہ میں کتابت حدیث، عہد صحابہ میں حفظ حدیث، عہد رسالت اور عہد صحابہ میں عمل کے ذریعہ حفاظت حدیث، عہد تابعین میں کتابت حدیث، حفظ حدیث اور تابعین، عہد تابعین کا ایک عظیم کارنامہ، روایت حدیث میں صحابہ اور دیگر ائمہ حدیث کا احترام واحتیاط۔

چوتھا عنوان: ہے سیرت رسول اور مستشرقین....

صفحات ساٹھ ہیں، حوالہ جات بھی ساٹھ ہیں، اس میں ضمنی عنوانات نہیں ہیں، مناسب ہے کہ قائم کردی جائیں۔

فاضل قلمکار چاہیں تو چاروں مرکزی عنوانات کو چار مستقبل ابواب میں تقسیم کر سکتے ہیں، ذیلی سرخیاں جوں کے توں بھی رکھ سکتے ہیں، ترمیم واضافہ سے مزید نکھار بھی پیدا کر سکتے ہیں، یوں ہی حوالہ جات کو باب کی وضاحت کے ساتھ درج کردیں تو میرے خیال میں یہ زیادہ بہتر ہوگا، جماعت اہل سنت میں عصری یا جبری موضوعات پر کم لکھا جاتا ہے، مولانا کمال احمد صاحب نے درج بالا موضوع پر لکھ کر ایک فرض کفایہ اتارا ہے، اس لئے وہ پوری جماعت کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں، حوصلہ افزائی کے حقدار بھی، جدید وقدیم کے ممتاز اسکالر ڈاکٹر سید علیم اشرف صاحب جائسی اس پر کچھ لکھتے تو میرا خیال ہے زیادہ باوزن ہوگا، خاکسار سے جو کچھ ہوسکا وہ حاضر کردیا، وہ بھی حضرت مصنف کی محبت، نیز اصرار پر، ایک بار پھر مولانا کمال صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور کمال ارجمندی کی دعا کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں۔

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی

۱۶ رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۸ ستمبر ۲۰۰۸ء

[نوٹ: ڈاکٹر صاحب نے یہ تقریظ مسودہ دیکھ کر تحریر فرمائی ہے، مبیضہ میں آپ کے مشورہ پر کافی حد تک عمل کیا گیا ہے۔ کمال علیمی]

7

''استشراق اور مستشرقین''ایک مطالعاتی تحقیق

تاثر۔حضرت علامہ مفتی محمد نسیم اشرف حبیبی

حبیبی دارالافتاء، افریقہ

دارالعلوم علیمہ، جمداشاہی کے جواں سال فاضل، مولانا کمال احمد علیمی نظامی کی ایک اچھوتی تصنیف ''تحریک استشراق (ماضی، حال، مستقبل)'' کے اہم ابواب دیکھے، جس سے ناچیز کی معلومات میں اضافہ ہوا، یہ کتاب ایک نئے موضوع پر مکمل ہے اور استشراق کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔

مولانا موصوف نے نہایت محنت، جستجو، اور عمیق مطالعہ کے بعد مستشرقین کی اسلام اور دینی علوم کے خلاف سازشوں کا پردہ چاک کیا ہے، اس موضوع پر اتنی مکمل اور معتبر حوالوں سے آراستہ تصنیف میری نظر سے نہیں گذری، میں مولانا علیمی صاحب زید علمہ کی اس تصنیف کو نشان راہ سمجھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اس راہ پر نئے نئے چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔

مصنف موصوف نے استشراق سے متعلق کوئی پہلو نظر انداز نہیں فرمایا ہے، یہاں تک کہ اس شر میں جو کچھ خیر کے پہلو ہیں، ان کو بھی مولانا موصوف نے پوری دیانت کے ساتھ اجاگر فرمایا ہے، کتاب اپنی جامعیت میں مثالی ہے، اردو میں ایک مکمل مطالعاتی کارنامہ ہے، موافقین اور مخالفین کی آراء کے حوالے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہیں، اس موضوع پر کام کرنے والے طلبہ اس سے نہ صرف استفادہ کر سکتے ہیں، بلکہ یہ کتاب انہیں بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی، یہ موضوع اگرچہ عوام کی دلچسپی کا نہیں ہے، لیکن مصنف کے سادہ اندازِ بیان نے اسے عوامی بھی بنا دیا ہے، خدا کرے عوام وخواص سب پڑھیں اور اپنی معلومات کو وسعت دیں۔

یہ ایک تاریخی اور علمی حقیقت ہے کہ استشراق صہیونی، مسیحی، المادی قوتوں کی اسلام دشمن تحریک ہے، جس نے امت مسلمہ میں آزادخیال، سہولت پسند، اور جدیدیت کے دلدادہ اذہان کو شکوک وشبہات میں مبتلا کیا ہے اور یہی اس تحریک کا ہدف ہے۔

اہل استشراق کی بددیانتی اور خباثتِ نفس پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے ص: ۴۳ پر ان کو چیلنج بھی کیا ہے کہ ''اگر ان کا ضمیر زندہ ہوتا تو علمی اور انسانی شرافت کے تقاضوں کی بندش نہ توڑتے۔''

رب تعالیٰ جواں سال فاضل کے علم ومطالعہ میں مزید برکتیں اور توانائیاں عطا فرمائے، ان کی تحقیق وجستجو کا سفر جاری رہے، دارالعلوم علیمیہ جس عظیم علمی اور تبلیغی شخصیت سے منسوب ہے، اسے میں اسی عظیم شخصیت کا روحانی فیضان سمجھتا ہوں، اور مصنف کو اس ادارہ سے وابستگی پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

قارئین! اس کتاب کا سنجیدگی اور پوری دلچسپی سے مطالعہ فرمائیں، اس طرح مصنف کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی اور آپ کی معلومات میں کافی اضافہ بھی ہوگا۔

رب تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں اسے قبولیت عام وتام عطا فرمائے اور مصنف کی عمر اور علم وعمل میں مزید برکت عطا فرمائے!

آمین بجاہ حبیبہ الکریم!

محمد نسیم حبیبی

حبیبی دارالافتاء، افریقہ

✿✿✿

تقدیم

علام سید علی علیمی علیگ

صحرائے عرب سے نکلنے والا دین، دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے ایک عظیم مذہب کے طور پر پوری دنیا میں پھیل گیا، چنانچہ ایک عیسائی مورخ بقول:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عرب کی زمین کو جیسے کسی نے جادو کے زور سے فاتحوں کے خطہ میں تبدیل کر دیا تھا، پھر اس کی خاک سے ایسے ایسے عالی ہمت اور بلند حوصلہ لوگ اٹھے کہ شمار وصفات کے اعتبار سے اور کہیں ان کی نظیر نہیں ملتی۔" (پی۔ کے حتی، تاریخ عرب، ص: ۴۴)

یہی مورخ ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"۷۳۲ء کے اختتام کے ساتھ ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کی پہلی صدی ختم ہوتی ہے، اس وقت آپ کے ماننے والے یعنی مسلمان ایک ایسی سلطنت فتح کر چکے تھے جس کے دامن ایک طرف خلیج بسکے اور دریائے سندھ اور حدود چین تک اور دوسری طرح بحیرہ خوارزم سے بالائی نیل تک پھیلے ہوئے تھے۔" (تاریخ عرب، ص: ۷۲)

صرف جنگ کے میدان ہی میں نہیں، مسلمان تہذیب وتمدن کے ہر میدان میں بھی پوری دنیا کے رہنما بن کر ابھرے، چنانچہ قرون وسطیٰ میں صدیوں تک عربی زبان ساری متمدن دنیا میں علم وثقافت اور ترقی پسند تفکر کے اظہار کا واحد ذریعہ بنی رہی، پی۔ کے حتی کے مطابق:

''نویں صدی سے لے کر بارہویں صدی کے درمیانی زمانے میں فلسفہ، طب، تاریخ، ہیئت اور جغرافیہ کی جتنی کتابیں عربی زبان کے ذریعہ عالم وجود میں آئیں، اتنی کتابیں کسی اور زبان میں نہیں لکھی گئیں۔'' (تاریخ عرب؛ ص:۹)

حتی نے ایک دوسری جگہ یہ انکشاف کیا ہے کہ:

''اس زمانہ میں جب کہ عرب علما ارسطو کا مطالعہ کر رہے تھے، یورپ میں شارلمین اور اس کے امرا اپنے نام کے ہجے سیکھ رہے تھے، ایک اسلامی شہر قرطبہ میں سترہ بڑے کتب خانے تھے، ان میں سے ایک کتب خانے میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں، ایسے زمانے میں جب کہ جامعہ آکسفورڈ کے عالم غسل کرنے کو بے دینوں کی رسم جانتے تھے، اسی قرطبہ کے مسلمان سائنس داں پر تکلف اور نزہت بیز حماموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔''
(تاریخ عرب؛ ص:۸)

یہاں تک کہ مسلمانوں کی علمی وتہذیبی عروج کا ایک زمانہ وہ بھی آیا جب غیر مسلم، مسلم کی طرح دِکھنے میں فخر محسوس کرنے لگے، ایک متعصب عیسائی مورخ بارو قرطبی نے بڑے ہی افسوس کے ساتھ لکھا تھا کہ:

''میرے دینی بھائی عربی شاعری اور عربی حکایات میں بڑی لذت محسوس کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کے فلاسفہ اور فقہا کی کتابوں کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتے ہیں، اس لئے نہیں کہ وہ اس مطالعہ کے ذریعے مسلمانوں کی تردید کریں بلکہ اس لئے کہ وہ اس عربی ادب کا مطالعہ کرکے عربی زبان میں کمال حاصل کر سکیں، آج ہمیں پادریوں اور راہبوں کے علاوہ ایسے عیسائی کہاں مل سکتے ہیں جو انجیل مقدسہ کی لاطینی تشریحات کا مطالعہ کرنا پسند کرتے ہوں، ہائے افسوس! ہمارے باصلاحیت عیسائی نوجوان عربی لغت وادب پر ایمان رکھتے ہیں، اس کی کتابوں پر زر کثیر صرف کرتے ہیں، اور ہر جگہ عربی زبان وادب کی عظمتوں کا ڈھنڈورا پیٹتے نظر آتے ہیں، لیکن جب ان سے کتب عیسوی کے متعلق پوچھا جائے بڑی نفرت سے کہتے ہیں کہ عیسائی کتابیں اس قابل نہیں کہ ان کی طرف توجہ مبذول کی جائے۔'' (اضواء علی الاستشراق والمستشرقین؛ ص:۱۷)

اسلامی تہذیب کے بڑھتے قدم کو روکنے کے لئے یہود ونصاریٰ نے معروضی تحقیق

کے لبادے میں ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیب وتمدن، تاریخ وادب، انسانی قدروں اور ملی خصوصیات، وسائل وامکانات کا مطالعہ کرنا شروع تا کہ مشرقی اقوام بالخصوص قوم مسلم کو اپنا ذہنی غلام بنایا جاسکے، اور ان پر اپنا مذہب، اپنی تہذیب مسلط کی جاسکے، ساتھ ہی سیاسی غلبہ حاصل کرکے اس کے وسائل حیات کا استحصال کیا جاسکے۔

اسی فکر اور تحریک کو بارہویں صدی میں تحریک استشراق کا نام دیا گیا، اور اس نہج پر کام کرنے والے اہل مغرب کو مستشرق کہا گیا۔

زیر نظر کتاب ''تحریک استشراق (ماضی، حال اور مستقبل)'' میں مولف کتاب حضرت علامہ کمال احمد علیمی نظامی نے بڑی خوبی کے ساتھ مستشرقین کے کارناموں کے تذکرہ کے ساتھ ان کی کارگزاریوں کا علمی احتساب بھی کیا ہے۔

کتاب مطالعہ کرنے پر آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام دشمن قوتیں ہماری علمی میراث پر سوالیہ نشان لگانے کے لئے رات دن انتھک محنت کر رہی ہیں اور ہم ہیں کہ خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔

خدا بھلا کرے ان لوگوں کا جنھوں نے ان کی علمی خیانتوں کو طشت ازبام کیا اور ملت اسلامیہ کو ان کے خطرے سے آگاہ کیا، ورنہ تو طٰہٰ حسین اور احمد امین جیسے ادیب اور اسکالر بھی ان کے دام تزویر میں پھنس کر انھیں کی راگ الاپتے اس دنیا سے رخصت ہوگیے۔

مولف کتاب کے بارے میں کچھ کہنے سے بہتر یہی ہے کہ کچھ نہ کہا جائے کیوں کہ جو انسان اتنے اہم موضوع پر قلم اٹھانے کی ہمت رکھتا ہو، جب کہ اس کے گردوپیش کا موحول اس طرح کے کام کے لئے سازگار ہی نہیں تھا، پھر بھی اس نے کیا اور بہت اچھا کیا۔۔ اس انسان کی تعریف کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ اس نے ایسے موضوع پر تفصیلی مباحث پیش کئے جس موضوع پر ہندوستانی سنیوں کا دامن علم وفضل کافی حد تک افلاس ومسکینی کا شکار رہے۔

مصنف نے کتاب کی تیاری میں جسٹس پیر کرم شاہ ازہری کی مایہ ناز تصنیف ضیاء النبی سے کافی استفادہ کیا ہے، اس کے علاوہ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع شدہ ''استشراق اور مستشرقین'' (مجموعہ مقالات) سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، ساتھ ہی ندوۃ

العلما، لکھنؤ کی لائبریری کے مخطوطات اور عربی کتابوں سے بھی کافی حد تک استفادہ کیا ہے۔

رب تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ اپنے حبیب کے صدقے مصنف کو دارین کی نعمتوں سے مالا مال کرے۔ آمین!

غلام سید علی علیمی علیگ

پرنسپل- نورجہاں عبد المصطفیٰ انٹر کالج، بیدی پور، بستی، یوپی۔

❁❁❁

7

باب اول

تحریک استشراق

- استشراق - تعارف
- استشراق، تبشیر اور استعمار کا واضح مفہوم
- تحریک استشراق کا آغاز
- تحریک استشراق کے چھ دور
- تحریک استشراق کی تاریخ - عہد بہ عہد
- حاملین استشراق کی قسمیں
- تحریک استشراق کے اہداف و مقاصد
- مستشرقین کے علمی کارنامے

استشراق۔تعارف

'مستشرق' مشتق ہے استشراق سے، جس کا مادہ 'شرق' ہے، جو ضد ہے 'غرب' کی، درحقیقت یہ الفاظ ترجمہ یا چربہ ہیں 'اوریئنٹلسٹ' اور 'اوریئنٹلزم' کا جو 'اورینٹ' سے ماخوذ ہیں، انگریزی میں 'اورینٹ'، 'ایسٹ' کا ہم معنیٰ ہے، اہل مغرب نے یہ نام اپنے ان نام نہاد اسکالروں کو دیا ہے جنہوں نے مشرقی علوم وفنون، زبان وادب اور تہذیب وثقافت کو جس میں مذہب بھی آجاتا ہے، اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا، اور ان کا خصوصی مطالعہ کرکے براہ راست ان سے واقفیت حاصل کی، عربی میں اس کے لئے کوئی لفظ پہلے سے موجود نہیں تھا، اس لئے جب اس کی ضرورت پیش آئی تو انگریزی ہی کے طرز پر الفاظ وضع کرلئے گئے۔

ثلاثی مزید کے ابواب میں سے باب استفعال جس کے وزن پر استشراق بنایا گیا ہے، اس کی ایک خاصیت 'صیرورۃ' اور 'اتخاذ' ہے جس میں بن جانے، اپنانے یا حاصل کرنے کا مفہوم ہوتا ہے، مثلاً 'استحجر الطين' مٹی پتھر بن گئی، 'استوطن القرية' بستی کو وطن بنایا، 'استفادہ' فائدہ حاصل کرنا، اسی اصول اور قاعدہ کے تحت جب کسی زمانہ میں کچھ لوگوں نے باہر سے آکر جزیرۃ العرب میں بودوباش اختیار کی اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھی عرب ہوگئے، تو ان کو عرب کے قدیم اور اصل باشندوں سے ممیز کرنے کے لئے اسی باب استفعال سے کام لے کر ایک لفظ بنایا گیا، 'استعرب' یعنی عرب بن گیا، چنانچہ عرب کی قدیم تاریخ میں 'عرب عاربہ' اور 'عرب مستعربہ' کی اصطلاحیں ملتی ہیں، اردو میں ہم اسے اصلی عرب اور نقلی عرب بھی کہہ سکتے ہیں، نئے اور پرانے، سچے اور جھوٹے سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ ازروئے عربی زبان استشراق کے معنی ہوئے بہ تکلف مشرقی بننا،

اور مستشرق کے معنی وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا، اور ظاہر ہے کہ اس فعل کی نسبت کسی مغربی ہی کی طرف ہو سکتی ہے، خود کسی مشرقی کا مشرقی بننا مہمل سی بات ہے۔(۱)

لفظ استشراق کا ظہور انگریزی زبان میں پہلی بار ۱۸۱۱ء میں ہوا، فرانسیسی زبان میں پہلی بار ۱۸۳۰ء میں ہوا۔(۲)

استشراق اور مستشرق کی لغوی تحقیق کے بعد آیئے دیکھتے ہیں کہ استشراق اور مستشرق کی اصطلاحی تعریف و تحقیق کیا ہے۔

استشراق کی عام تعریف یہ ہے:

''غیر مشرقی لوگوں کا مشرقی زبانوں، تہذیب، فلسفے، ادب اور مذہب کے مطالعے میں مشغول ہونے کا نام استشراق ہے۔''(۳)

آکسفورڈ کی جدید ڈکشنری میں مستشرق کی تعریف یہ کی گئی ہے:

''مستشرق وہ ہے جو مشرقی علوم و آداب میں مہارت حاصل کرے۔''(۴)

ڈاکٹر عبدالحمید غراب نے اپنی کتاب 'رویۃ إسلامیۃ للاستشراق' میں استشراق کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

'استشراق' مغربی اسلوب فکر کا نام ہے جس کی بنیاد مشرق و مغرب کی نسلی تقسیم کے نظریے پر قائم ہے، جس کی رو سے اہل مغرب کو اہل مشرق پر نسلی اور ثقافتی برتری حاصل ہے۔''(۵)

مذکورہ کتاب میں ہے:

''استعماری مغربی ممالک کے علما اپنی نسلی برتری کے نظریے کی بنیاد پر مشرق پر غلبہ

۱۔ اسلام اور مستشرقین ۱/ ۷۵، ۷۶، مطبوعہ دار المصنفین: اعظم گڑھ۔

۲۔ الاسلام والمستشرقون ص: ۱۲۸؛ مطبوعہ عالم المعرفۃ، جدہ: ۱۹۸۵ء۔

۳۔ الاستشراق رسالۃ الاستعمار، ص: ۱۴۳؛ مطبوعہ دار الفکر العربي، قاہرہ ۱۹۹۳ء۔

۴۔ الاستشراق رسالۃ الاستعمار، ص: ۱۴۳؛ مطبوعہ دار الفکر العربي، قاہرہ ۱۹۹۳ء۔

۵۔ رویۃ اسلامیۃ للاستشراق ص: ۷؛ مطبوعہ دار الاصالۃ للثقافۃ والنشر والاعلام، ریاض: ۱۹۸۸ء۔

حاصل کرنے کے لیے اس کی تاریخ، تہذیبوں، ادیان، زبانوں، سیاسی اور اجتماعی نظاموں، ذخائر دولت اور امکانات کا جو تحقیقی مطالعہ غیر جانبدارانہ تحقیق کے بھیس میں کرتے ہیں اسے استشراق کہا جاتا ہے۔"(۱)

استشراق کی مذکورہ بالا تعریفات عام ہیں، ان کے تحت ہر وہ غیر مشرقی عالم اور اسکالر آ جائے گا جو مشرق سے متعلق کسی بھی دین اور دھرم کی تحقیق کرے، اور اس کی تہذیب وثقافت، زبان وادب کا مطالعہ اس غرض سے کرے کہ اہل مشرق پر اسے نسلی برتری حاصل ہو۔

"المنجد" میں مستشرق کی تعریف یہ ہے:

"العالم باللغات والآداب والعلوم الشرقية"(۲)

مشرقی زبانوں، آداب اور علوم کے جانکار کو مستشرق کہتے ہیں۔

مذکورہ تعریف پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شرف الدین لکھتے ہیں:

"کیا ہم مشرق سے تعلق رکھنے والے ایسے کسی عالم کو مستشرق کہہ سکتے ہیں جو مشرقی علوم والسنہ کا جاننے والا ہو، اسی طرح کیا ہم کسی ایسے مسلمان کو مستشرق کہہ سکتے ہیں خواہ اس کا تعلق مغرب ہی سے کیوں نہ ہو، ظاہر ہے نہیں کہہ سکتے ہیں، معلوم ہوا کہ اصطلاحاً یا عرفاً یہ لفظ مخصوص ہے ان غیر مسلم علمائے مغرب کے لئے، جو مشرقی زبانوں اور علوم وآداب میں دلچسپی رکھتے ہوں، خود مشرقی زبانوں اور علوم وآداب میں بھی تحدید کی ضرورت ہے، مشرق سے تعلق رکھنے والی غیر مسلم زبانوں، غیر اسلامی علوم وفنون اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے عالم کو بھی مستشرق نہیں کہہ سکتے، چاہے وہ کوئی غیر مسلم اور مغربی ہی کیوں نہ ہو، سنسکرت، ہندومت اور بدھ مت کے کسی عیسائی مغربی اسکالر کو کوئی مستشرق نہیں کہہ سکتا، تو گویا بات یہاں تک پہونچی کہ مستشرق مغرب کے ان غیر مسلم خاص کر یہودی اور عیسائی اسکالروں کو کہتے ہیں جو اسلام اور اسلامی علوم، اسلامی زبانوں اور اسلامی تہذیب وثقافت کے مطالعہ

۱۔ رویۃ اسلامیۃ للاستشراق ص: ۸: مطبوعہ دار الاصالۃ للثقافۃ والنشر والاعلام: ریاض: ۱۹۸۸ء۔

۲۔ المنجد ص: ۳۸۴: مطبوعہ دار الشرق: بیروت۔

میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر شرف الدین کے اس تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستشرق کی اصطلاح صرف اسی غیر مسلم مغربی عالم کے ساتھ خاص ہے، جو صرف مذہب اسلام کو اپنی تحقیق و تفحص کی جولان گاہ بنائے، اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کے عالم کو مستشرق نہیں کہا جا سکتا ہے، ڈاکٹر صاحب کے نظریئے کی تائید جناب محمد طفیل ادارہ تحقیقات اسلامی پاکستان کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے:

"یہ اصطلاح صرف ان غیر مسلموں کے لئے استعمال کی جاتی ہے جن کا تعلق یورپین ممالک سے ہے، اور انہوں نے اسلام کے بارے میں کچھ لکھا ہے، لیکن عام طور پر یہ اصطلاح ان اصحاب علم کے بارے میں استعمال ہوتی ہے جو غیر مسلم ہوں اور انہوں نے اسلام کے بارے میں کچھ نہ کچھ کام کیا ہو۔"(۲)

ڈاکٹر عمر فروخ بھی جزوی طور پر اسی نظریئے کے موید ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

"فالمستشرق اذن غربي غير مسلم (من اوربا أو اميركا) يدرس اللغة العربية وبعض وجوه الثقافة الاسلامية۔"(۳)

معلوم ہوا کہ مستشرق وہ غیر مسلم مغربی عالم ہے جو عربی زبان اور اسلامی تہذیب کے کسی رخ کا مطالعہ کرے۔

مذکورہ بالا تعریفات کی روشنی میں دو نظریے سامنے آتے ہیں، ایک یہ کہ مستشرق کا لفظ اسی غیر مسلم مغربی عالم پر بولا جائے گا جو صرف اسلامی امور سے بحث کرے، دوسرا یہ کہ اس لفظ کا اطلاق ہر اس مغربی غیر مسلم عالم پر ہو سکتا ہے جو مشرق سے متعلق کسی بھی مذہب کے امور سے بحث کرے، مگر اہل نظر پر مخفی نہیں کہ مستشرق صرف اسی کو نہیں کہا جائے گا جس نے اسلامی امور سے بحث کی ہو، بلکہ ہر اس مغربی کو مستشرق کہہ سکتے ہیں جس نے اقوام مشرق بالخصوص مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے بحث کی ہو، چنانچہ ہم کو بہت سارے مستشرقین ملیں

۱۔ اسلام اور مستشرقین ۲/۵۰؛ مطبع سابق۔

۲۔ اسلام اور مستشرقین ۲/۱۳۸؛ مطبع سابق۔

۳۔ الاسلام والمستشرقون ص:۱۲۷؛ مطبوعہ عالم المعرفۃ جدہ ۱۹۸۵ء۔

گے جنھوں نے صرف اسلام ہی نہیں بلکہ دنیا کے بڑے بڑے دیگر مذاہب مثلاً بدھ مذہب وغیرہ سے بھی بحث کی ہے، چنانچہ منسوتا یونیورسٹی میں مستشرقین کی ایک انجمن قائم ہوئی، جس نے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب مثلاً بدھ مت، عیسائیت اور اسلام کی تدریس کے لئے ایک مخصوص پروگرام وضع کیا۔"(۱)

اس نظریے کی تائید علامہ پیر کرم شاہ ازہری صاحب کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے:

"اہل مغرب بالعموم اور یہود ونصاریٰ بالخصوص جو مشرقی اقوام خصوصاً ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیب وتمدن، تاریخ وادب، انسانی قدروں، ملی خصوصیات ومسائل حیات اور امکانات کا مطالعہ معروضی تحقیق کے لبادے میں اس ذہن سے کرتے ہیں کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان پر اپنا مذہب اور اپنی تہذیب مسلط کرسکیں، اور ان پر سیاسی غلبہ حاصل کرکے ان کے وسائل حیات کا استحصال کرسکیں، ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے اور جس تحریک سے وہ لوگ منسلک ہیں وہ تحریک استشراق کہلاتی ہے۔"(۲)

علامہ ازہری صاحب کی مذکورہ بالا تعریف نہ صرف یہ کہ نہایت جامع ومانع ہے بلکہ یہ مذکورہ بالا دونوں نظریوں میں تطبیق بھی پیدا کرتی ہے کہ مستشرق صرف اسے نہیں کہا جائے گا جو صرف اسلامی علوم وفنون سے بحث کرے بلکہ ہر اس عالم پر اس لفظ کا اطلاق ہوسکتا ہے جو مشرقی اقوام ومذاہب بالخصوص مذہب اسلام کا مطالعہ کرے۔

۱۔ الاستشراق وجہ الاستعمار، ص: ۱۴؛ بحوالہ ضیاء النبی: ۶/ ۱۶۰؛ مطبوعہ المجمع المصباحی، مبارکپور۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۳۳؛ مطبع سابق۔

استشراق، تبشیر اور استعمار کا واضح مفہوم

اہل مغرب جو اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں صدیوں سے مصروف عمل ہیں، وہ تین منظم تنظیموں میں منقسم ہیں، ایک وہ ہیں جنہوں نے عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے، یہ لوگ دیگر ادیان کے مقابلہ میں بالعموم اور اسلام کے مقابلے میں بالخصوص عیسائیت کی فوقیت ثابت کرنے کے لئے کوشش کرتے ہیں، یہ کھل کر اسلامی تعلیمات اور تاریخ اسلام کی مقتدر شخصیات کے کردار پر بحث کرتے ہیں، یہ لوگ مبشر اور منصر کہلاتے ہیں اور ان کی تحریک کو تبشیر یا تنصیر کی تحریک کہا جاتا ہے۔

مغربی سیاستداں، سفارت کار، اور فوجی جو مشرقی ممالک پر استعماری غلبے کی کوششوں کا حصہ ہیں وہ مستعمرین کہلاتے ہیں، اور جس تحریک سے ان لوگوں کا تعلق ہے اس تحریک کو تحریک استعمار کہا جاتا ہے۔

اور جو لوگ علم کی خدمت کا لبادہ اوڑھ کر مصروف عمل ہیں، وہ مستشرقین کہلاتے ہیں۔ عموماً یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ تینوں تنظیمیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں، یہ نہ تو ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہیں، اور نہ ان کے کام کا میدان ایک ہے، بلکہ یہ سب اپنے اپنے میدان میں کام کر رہی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے، یہ تینوں تنظیمیں دراصل ایک ہی ہیں، اور ان کے کام میں بھی زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

تحریک استشراق کو صحیح معنوں میں اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب ان تینوں تنظیموں کے درمیان جو یکسانیت اور اعتباری مغایرت ہے اسے سمجھ لیا جائے، اس لئے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں تنظیموں کا تعارف قارئین کرام کے سامنے پیش کردوں۔

'استشراق'۔ مشرق اور بالخصوص اسلام کے تفصیلی مطالعہ کا نام ہے، اور جن لوگوں نے اس کام کا آغاز کیا ان میں اکثریت راہبوں اور پادریوں کی تھی، کلیسا صدیوں علم کا دشمن رہا، اس کے دورِ اقتدار میں کتابیں جلتی رہیں، علما کلیسا کی جہالت کی بھینٹ چڑھتے رہے اور مدرسے بند ہوتے رہے، لیکن جب مسلمانوں نے اپنے عمل سے ظاہر کردیا کہ قوموں کی ترقی کا راز علم میں مضمر ہے، تو علوم اسلامیہ کو مغرب میں منتقل کرنے کا بیڑا بھی انہیں لوگوں نے اٹھایا جن کے لئے مستشرقین سے زیادہ مبشرین کی اصطلاح موزوں ہے، راہبوں نے عربی سیکھی، کتابوں کے تراجم کئے، مدارس قائم کئے اور ممالک اسلامیہ سے قیمتی مخطوطے اکٹھے کرنے کے لئے اپنی زندگی بھر کی کمائیاں صرف کیں، مغربی یونیورسٹیوں میں عربی کی تدریس کا فیصلہ سب سے پہلے کلیسا کی کانفرنس میں ہوا، یہ تمام حقائق اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ استشراق اور تبشیر دو علیحدہ تحریکیں نہیں بلکہ ایک ہی تحریک کے دو مختلف روپ ہیں۔

اسی طرح مبشرین اور مستشرقین کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کا استعماری طاقتوں سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو امن پسند اور صلح جو لوگ ہیں، جو دین اور علم کی خدمت میں مگن ہیں، لیکن یہ تاثر بھی بالکل غلط ہے، جس طرح استشراق کی تحریک کو تبشیر سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے، اسی طرح استشراق اور تبشیر دونوں کو استعمار سے علیحدہ کرنا بھی ممکن نہیں ہے، ان تحریکوں کی تاریخ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ مبشرین اور مستشرقین استعماری طاقتوں کے لئے راستہ ہموار کرتے رہے، انہیں مشرق کے متعلق پالیسیاں وضع کرنے کے لئے ضروری معلومات مہیا کرتے رہے، اور ان خدمات کے بدلے میں مستعمرین نے دل کھول کر ان کی مالی امداد کی، ان کے علمی منصوبوں کے لئے سرمایہ فراہم کیا، اور ان کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ماحول کو سازگار بنایا، گویا مستشرقین مستعمرین کے فکری راہنما تھے اور مستعمرین مستشرقین کے پشت پناہ اور محافظ، ان کے مقاصد بھی ایک تھے اور ان مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کی مساعی میں بھی ہم آہنگی موجود تھی۔(۱)

۱۔ضیاء النبی:۶/ ۱۷۳؛ مطبع سابق۔

ہمارے سامنے کئی ایسے دلائل بھی موجود ہیں، جن سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ مذکورہ تینوں تنظیمیں ایک ہی ہیں، چنانچہ 'کارل ہیزچ بیکر' جو جرمنی کا ایک بہت بڑا مستشرق ہے اور جرمنی کے مجلہ 'الاسلام' کا مؤسس ہے، اس نے افریقہ میں جرمن استعمار کا راستہ ہموار کرنے کی زبردست کوششیں کیں، چنانچہ ایک دوسرا جرمن مستشرق 'ادمرچ ہارمان' لکھتا ہے:

''۱۹۱۹ء سے پہلے اسلام کے متعلق جرمنوں کا مطالعہ حسن نیت پر مبنی نہیں تھا، کارل ہیزچ بیکر جو بہت بڑا مستشرق ہے، وہ سیاسی سرگرمیوں میں ملوث تھا، اس نے ۱۹۱۴ء میں برطانیہ کے مقابلے میں اسلام کو سیاسی ڈھال کے طور پر استعمال کرنے میں زبردست سرگرمی دکھائی۔''(۱)

فرانسیسی مستشرق 'ہانوتو' نے اپنی کتاب میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے افریقہ کی اسلامی نوآبادیات میں فرانسیسی سیاست کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے فکری مواد اختراع کیا۔(۲)

ڈاکٹر ابراہیم اللبانی لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے اہل سیاست کا السنہ مشرقیہ کے تدریسی اداروں کے اساتذہ کے ساتھ گہرا ربط ہوتا ہے، اور اسلامی ممالک سے متعلقہ امور کا فیصلہ کرنے سے پہلے وہ مستشرقین کی آراء کو دقت نظر سے دیکھتے ہیں، میں نے خود ایک مستشرق کی زبانی سنا ہے جو کہہ رہا تھا کہ مسٹر ایڈن مشرق وسطی کے متعلق فیصلہ کرنے سے پہلے مستشرقین کو جمع کرتا تھا، ان کی آراء کو سنتا تھا اور پھر ان کی آراء کی روشنی میں فیصلہ کرتا تھا۔''(۳)

حاصل کلام یہ کہ استشراق، تبشیر اور استعمار، تینوں کا مقصد ایک ہی ہے، ہاں تینوں کے کام کا انداز الگ الگ ہے، استشراق کی تحریک اپنے مقصد کی حصولیابی کے لئے علوم اسلامیہ کی خدمت اور ان کی حفاظت وصیانت کا ڈھونگ رچاتی ہے، تبشیر کی تحریک فلاحی

۱۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری: ص: ۵۶: مطبوعہ دار المنار قاہرہ: ۱۹۸۹ء۔

۲۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری: ص: ۵۷: مطبوعہ دار المنار قاہرہ: ۱۹۸۹ء۔

۳۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری: ص: ۵۸: مطبوعہ دار المنار قاہرہ: ۱۹۸۹ء۔

کاموں اور انسانیت کی خدمت کے لبادہ میں اپنے مقصد کی حصولیابی کے لئے کوشاں ہے، جب کہ استعماری تحریک اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے روپے پیسے اور طاقت کا استعمال کرتی ہے، عمومی مقصد سب کا ایک ہے اسلام کی تہذیب وتمدن اس کے اخلاقی اقدار اور اس کی حقانیت کو داغ دار کرنا، اس کو روئے زمین سے نیست ونابود کرنا۔

❁❁❁

تحریک استشراق کا آغاز

اس سلسلے میں محققین کے بہت سارے نظریات ہیں، ڈاکٹر محمود حمدی زقزوق لکھتے ہیں:

''بعض لوگ کہتے ہیں کہ تحریک استشراق کا آغاز ۱۳۱۲ء میں ہوا، جب 'فینا' میں کلیسا کی کانفرنس منعقد ہوئی، اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان کی تدریس کے لیے باقاعدہ Chairs قائم کی جائیں۔''(۱)

ڈاکٹر محمد احمد دیاب لکھتے ہیں:

''بعض لوگ کہتے ہیں کہ تحریک استشراق کا آغاز تیرہویں صدی عیسوی میں ہوا، جب قشتالہ کے بادشاہ 'الفونس دہم' نے ۱۲۶۹ء میں مریسلیا میں اعلیٰ تعلیمات کا ادارہ قائم کیا، اس ادارے نے ابوبکر الرقوطی کی سربراہی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان، عیسائی اور یہودی عالم مقرر کیے، اور انھیں تصنیف، ترجمے اور تلخیص کے کام پر مامور کیا، اس ادارے نے انجیل، تلمود اور قرآن کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ کیا، اسی صدی میں سسلی کے بادشاہ فریڈرک ثانی نے مائیکل اسکاٹ کی نگرانی میں بعض اسلامی علوم کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا، شاہ سسلی نے ان ترجمہ شدہ کتابوں کے کئی نسخے تیار کرائے اور انھیں یورپ کے جامعات، مدارس، اور دیگر علمی اداروں کو بطور تحفہ بھجوایا، ان میں سے کچھ کتابیں سترہویں صدی عیسوی تک پڑھائی جاتی رہیں۔(۲)

۱۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری، ص: ۲۵، مطبوعہ دار المنار قاہرہ: ۱۹۸۹ء۔

۲۔ اضواء علی الاستشراق والمستشرقین، ص: ۱۴، مطبع سابق۔

اسی طرح سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ تحریک استشراق کا آغاز بارہویں صدی عیسوی میں ہوا، جب ۱۱۴۳ء میں پطرس محترم کے ایما پر پہلی مرتبہ قرآن کریم کا لاطینی زبان میں ترجمہ مکمل ہوا، پطرس محترم دیر کلونی کا رئیس تھا، یہ اپنے دل میں اسلام کے خلاف شدید تعصب رکھتا تھا، وہ عیسائیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مصالحانہ رویہ اپنانے سے روکتا اور انھیں مسلمانوں سے متنفر کرنے کی کوشش کرتا، پطرس محترم نے علوم کے مغربی زبانوں میں تراجم کے لیے ایک جماعت تیار کی، ان میں ایک انگریز عالم رابرٹ آف کیٹن تھا جس نے قرآن حکیم کا پہلا لاطینی ترجمہ کیا، پطرس محترم نے قرآن حکیم کے اس ترجمہ پر مقدمہ بھی لکھا، اس کے علاوہ اس کی قائم کردہ جماعت نے کچھ اور عربی کتابوں کے ترجمے بھی کیے، اور ان کتابوں کا مجموعہ 'مجموعہ کلونی' کے نام سے مشہور ہوا۔(۱)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تحریک استشراق کا آغاز دسویں صدی عیسوی میں ہوا، جب فرانس کا ایک راہب جریردی اوراليا ک [۹۴۰ـ ۱۰۰۳] حصول علم کی خاطر اندلس گیا، اشبیلہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں میں علم حاصل کیا، اور یورپ بھر میں عربی زبان وادب اور ثقافت کا سب سے بڑا عالم شمار ہوا، اور بعد میں ۹۹۹ء سے لے کر ۱۰۰۳ء تک سلفستر ثانی کے لقب سے پاپائے روم کے منصب پر فائز رہا۔(۲)

علامہ پیر کرم شاہ ازہری کے مطابق استشراق کی تحریک کو مشرق اور مغرب کے اہل کتاب نے مل کر آٹھویں صدی عیسوی میں شروع کیا، مشرق اہل کتاب کا نمائندہ یوحنا دمشقی [۶۷۶ـ ۷۴۹] تھا جو خلیفہ ہشام کے زمانے میں بیت المال کا ملازم تھا، اس نے ملازمت ترک کردی، اور فلسطین کے ایک گرجے میں بیٹھ کر مسلمانوں کی تردید میں کتابیں لکھنے لگا، اس نے اسلام کے خلاف دو کتابیں لکھیں:

(۱) "محاورة مع المسلم"؛

(۲) "ارشادات النصاری فی جدول المسلمین" تھا۔

یہ دونوں تصنیفات اسی مقصد کے تحت لکھی گئی تھیں، جس کے تحت مستشرقین نے

۱۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری، ص: ۳۲؛ مطبع سابق۔

۲۔ اضواء علی الاستشراق والمستشرقین، ص: ۱۳؛ مطبع سابق۔

تصنیفات کے انبار لگائے ہیں، اس لیے یوحنا دمشقی کے مساعی کو تحریک استشراق کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے، کچھ لوگ مشرق کا باشندہ ہونے کی بنا پر یوحنا دمشقی کو مستشرق تسلیم نہیں کرتے ہیں، لیکن ہم [ازہری صاحب] نے جو مستشرقین کی تعریف کی ہے، اس کی رو سے وہ مستشرق ہی شمار ہوگا، اگر یوحنا دمشقی کو مستشرق شمار نہ کیا جائے تو بھی تحریک استشراق کا آغاز آٹھویں صدی عیسوی سے ماننا پڑے گا، کیوں کہ اسی صدی میں مسلمانوں نے اندلس کو نہ صرف عسکری طور پر فتح کیا تھا بلکہ مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے مذہب نے بھی وہاں پر اپنا تسلط قائم کرلیا تھا۔(۱)

علامہ ازہری صاحب کے اس نظریہ کی تائید کہ آٹھویں صدی عیسوی کو تحریک استشراق کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے، پروفیسر سید حبیب الحق ندوی کی اس بات سے بھی ہوجاتی ہے، جسے انھوں نے اپنے مقالہ 'اسلام اور مستشرقین' میں ذکر کیا ہے:

”جدید مستشرقین کا نسب نامہ یا شجرۂ نسب جان آف دمشق [۷۰۰ یا ۷۴۹ء] سے جاملتا ہے، جس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کی تحریک کا آغاز کیا، اور تحریری مناظرات کا منفیانہ دور شروع کیا اور بزنطینی تاریخی روایات کا مصدر اول تسلیم کرلیا گیا، دمشقی جان نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے خلاف تحریک چلائی۔“(۲)

واضح رہے کہ جان آف دمشق کا زمانہ آٹھویں صدی عیسوی کا ابتدائی حصہ یا اس کا وسط ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تحریک استشراق کا آغاز ساتویں صدی عیسوی کے آخر اور آٹھویں صدی کے آغاز میں یا اس کے وسط میں ہوا۔

نیز علامہ ازہری صاحب کے اس موقف کی تائید کہ تحریک استشراق کا آغاز آٹھویں صدی عیسوی میں اس وقت ہوا، جب مسلمانوں نے وہاں پر اپنا تسلط قائم کرلیا، ڈاکٹر محمود حمدی زقزوق کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے:

”وعلی ایة حال فان الدافع لهذه البدایات المبکرة للاستشراق کان یتمثل فی ذالك الصراع الذی بین العالمین الاسلامی والمسیحی فی

۱۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۲۶، ۱۲۷؛ مطبع سابق۔

۲۔ اسلام اور مستشرقین: ۳/ ۱۲؛ مطبع سابق۔

الاندلس وصقلية كما دفعت الحروب الصليبية بصفة خاصة الى اشتغال الاوربيين بتعاليم الاسلام وعاداته۔"(۱)

بہر حال تحریک استشراق کے تعلق سے ان نئی باتوں کے آغاز کے داعیہ کا تصور اندلس اور صقلیہ میں جاری عالم اسلام اور عالم مسیحیت کے درمیان جاری کشمکش میں کیا جا سکتا ہے، اسی طرح صلیبی جنگوں نے خاص طور سے اہل یورپ کو اسلام کی تعلیمات وعادات کے مطالعہ پر مجبور کیا۔

مذکورہ بالا نظریے کی تائید کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب لکھتے ہیں:

"لقد بدأ الاستشراق منذ أن اتصل الأوربيون بالمسلمين فى الاندلس واطلعوا على تقدم المسلمين العلمي ،فرأوأن ينقلوا علوم المسلمين الى لغاتهم ،وفعلا كانت قرطبة وغيرها من المراكز العلمية الاسلامية"(۲)

یعنی تحریک استشراق کا آغاز اس وقت ہوا، جب اہل یورپ اندلس میں مسلمانوں سے ملے، اور ان کی علمی ترقی پر آگاہ ہوئے، انھوں نے مناسب سمجھا کہ مسلمانوں کے علوم کو اپنی زبان میں منتقل کر دیں، نتیجۃً قرطبہ وغیرہ اسلامی علوم کا مرکز بن گئے۔

بعض حضرات کے مطابق تحریک استشراق کا نقطۂ آغاز گیارہویں صدی عیسوی کا ابتدائی حصہ ہے، چنانچہ ڈاکٹر محمود حمدی زقزوق لکھتے ہیں:

"ترجع البدايات للاستشراق لدى بعض الباحثين الى مطلع القرن الحادي عشر"(۳)

بعض علما کے نزدیک استشراق کا آغاز گیارہویں صدی کے آغاز میں ہوا۔

بعض حضرات کے مطابق اس تحریک کا آغاز اس وقت ہوا، جب اہل مغرب نے مشرق پر اپنی حاکمیت قائم کرنی شروع کی، اور ایک ایک کر کے اکثر بلاد شرقیہ پر اپنا استعماری

۱۔ الاسلام والمستشرقون، ص:۷۲، مطبع سابق۔

۲۔ الاسلام والمستشرقون:۷۵، مطبع سابق۔

۳۔ الاسلام والمستشرقون، ص:۲۷، مطبع سابق۔

پنجہ گاڑ دیا، چنانچہ ڈاکٹر خواجہ احمد فارقی لکھتے ہیں:

''جب اقوام مغرب نے مشرق کا بحری راستہ معلوم کیا، اور مشرق پر اپنی حاکمیت قائم کرنا شروع کی تو ضرورت بھی محسوس کی کہ ان کی زبانوں کو، ان کے مذاہب کو اور ان کی تہذیب وتمدن کو سمجھیں اور ان کو اپنے رنگ میں اس طرح پیش کریں کہ مغرب مقابلۃً اعلیٰ وارفع نظر آئے، اور ان کی صنعت وحرفت اور سامان تجارت بہتر ٹھہرے، جن عالموں نے اس اقلیم میں قدم رکھا، وہ مستشرق کہلائے اور پورا ایک نیا عالم ''اور ینٹلزم'' کے نام سے وجود میں آیا۔'' (۱)

صحیح بات یہ ہے کہ اس تحریک کا آغاز عہد رسالت ہی سے ہو چکا تھا، ہاں بنام 'استشراق' اس کی تشہیر نہیں ہوئی تھی، جو کام آج مستشرقین کر رہے ہیں، وہی کام عہد رسالت میں ان کے آباو اجداد بہت پہلے انجام دے چکے ہیں، چنانچہ جس طرح آج کے مستشرقین خدمت علم کے لبادہ میں ملبوس ہو کر دینی ومذہبی کتابوں میں تحریف وتغیر کر کے حقائق کو دیدہ دلیری کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے آنے نہیں دیتے ہیں، اسی طرح عہد رسالت کے یہود ونصاریٰ بھی حقائق پوشی کرنے میں ماہر تھے، کون نہیں جانتا کہ توریت وانجیل میں نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت واضح لفظوں میں موجود تھی، مگر یہود ونصاریٰ نے اپنے ضمیر اور اپنی غیرت کو بالائے طاق رکھ کر اس بشارت کو چھپانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا، جس طرح آج کے مستشرقین علم کے شیدائی ہیں اور ان کے علمی دبدبے کا سکہ ہر چہار سو رائج ہے، اسی طرح عہد رسالت کے یہود ونصاریٰ بھی عرب کی جہالت بھری فضا میں علم وتحقیق کا روشن مینار تصور کیے جاتے تھے، اور ان کے بھی علمی جاہ وجلال کا چہار دانگ عالم میں غلغلہ تھا، جس طرح آج کے مستشرقین کی علمی کدو کاوش کے پیچھے استعمار پسندی کی کارفرمائی نظر آتی ہے، اسی طرح اس دور میں بھی یہود ونصاریٰ کے علمی جدوجہد کے پس پردہ عوام پر حکمرانی کا ناپاک جذبہ کارفرما تھا، اور جس طرح آج کے مستشرقین استعمار پسند طاقتوں کے دم چھلے ہیں، اسی طرح عہد رسالت کے یہود ونصاریٰ بھی اس دور کے امرا وسلاطین کے آلۂ کار اور ان کے مشیر تھے، مذکورہ بالا امور میں یکسانیت کے ساتھ سب سے بڑی ہم آہنگی ان

۱۔ اسلام اور مستشرقین، ص: ۱۰۳، مطبع سابق۔

مقاصد میں ہے، جن کے ارد گرد ان کی علمی و عملی سرگرمیاں گردش کرتی ہیں، اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت، اسلامی پیغام کو نیست و نابود کرنا، یا کم از کم اس کی حقانیت کے ارد گرد شکوک وشبہات کا حصار کھڑا کرنا اور اسلام اور مسلمانوں کو صحیح طور سے سمجھ کر ان کی عیب جوئی کرنا مستشرقین کے اہم مقاصد ہیں، ظاہر ہے یہ اہداف و مقاصد جس طرح سے آج کے مستشرقین کی علمی و عملی حرکات کا محرک ہیں، یوں ہی ابتدائے اسلام کے یہود و نصاریٰ کے پیش نظر بھی یہی اغراض و مقاصد تھے۔

ان یہود و نصاریٰ کے سامنے ہمیشہ یہی اہداف و مقاصد تھے، ان کی حصولیابی کے لیے انھوں نے سو سو جتن کیے، صدہا تدبیریں اپنائیں، نہ جانے کتنے روپ دھارے، انھیں تدابیر میں سے ایک تدبیر کا نام 'استشراق' ہے، چنانچہ 'اسلام اور مستشرقین' میں ہے:

''اسلام جب انھیں [یہود و نصاریٰ کو] ایک غالب قوت کی حیثیت سے ابھرتا نظر آیا، تو انھوں نے اس کو روکنے کے لے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، اور حالات کے تحت ادل بدل کر تمام تدبیریں اختیار کیں، جو وہ کر سکتے تھے، انھیں تدابیر میں سے ایک تدبیر وہ بھی تھی، جسے آج کی زبان اور اصطلاح میں استشراق کا نام دیا جاتا ہے۔''(۱)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مقصد اور طریقۂ کار کے لحاظ سے تحریک استشراق کا آغاز اسی عہد میمون میں ہو چکا تھا، جب کہ اسلام اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ ظہور پذیر ہوا، حالات و مقتضیات نے ان کے طریقۂ کار، تدبیر اور ٹائٹل میں ضرور تبدیلی پیدا کی، مگر بنیادی مقصد میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، ظاہر ہے ٹائٹل اور طریقۂ کار میں تبدیلی سے اصل حقیقت تو بدلتی نہیں، اس لیے ماننا پڑے گا کہ اس تحریک کا آغاز عہد رسالت ہی میں ہو چکا تھا، جو آج تک جاری و ساری ہے۔

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۵۶؛ مطبع سابق۔

تحریک استشراق کے چھ دور

تحریک استشراق کی تاریخ کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک چھ ادوار پر مشتمل ہے، ذیل میں ہم ان چھ ادوار کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں، اس اجمالی جائزے میں ہم نے ہر دور کے مشہور مستشرقین اور ان کی سرگرمیوں نیز اس دور کے اہم اداروں پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

✿ - دورِ اوّل

اس دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب مسلمانوں نے اندلس کو علم وحکمت اور تہذیب وتمدن کا مرکز بنادیا تھا، اور اہل مغرب اس شمع علم سے اکتساب نور یا اس شمع کو بجھانے کے لیے جوق درجوق اندلس کا رخ کررہے تھے، اس دور کی مقتدر شخصیات میں 'جریری دی اورالیاک' ہے، یہ فرانسیسی راہب تھا، فرانس سے اندلس آیا اور وہاں علوم وفنون حاصل کیے، اشبیلیہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہا، اور عربی زبان وادب، ریاضی اور علم الفلک میں مہارت حاصل کی، ۹۹۹ء سے ۱۰۰۳ء تک پاپائیت کے منصب پر فائز رہا۔(۱)

اس کے علاوہ اس دور کے اہم مستشرقین یہ ہیں:

پطرس محترم:

یہ فرانسیسی راہبوں میں سے تھا، جسے اس کی وسعت علم کی بناپر ۱۱۲۳ء میں دیر کلونی کا رئیس بنایا گیا۔(۲)

۱۔ الاسلام والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری، ص: ۲۶، مطبع سابق۔

۲۔ اضواء علی الاستشراق والمستشرقین، ص: ۱۳، مطبع سابق۔

جوستاف بولون کے بقول:

"یہ ایک پرانا فوجی تھا، بعض وجوہات کی بنا پر اس کی روحانی زندگی اضطراب کا شکار ہوگئی، تو اس نے رہبانیت اختیار کرلی، یہ راہب پطرس متعصب کے نام سے مشہور تھا، لیکن تاریخ نے اس کو پطرس محترم بنادیا۔" (۱)

جیرار دی کریمون:

یہ اطالوی الاصل ہے، اس کا تعلق وینسی راہبوں سے تھا، یہ طلیطلہ گیا، وہاں زبان وادب میں مہارت حاصل کی، اور کندی، فارابی، اور ابن سینا کے فلسفے کو عربی سے لاطینی زبان میں منتقل کیا، اس نے رازی کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی کیے، ارسطو کی کتاب الاحجار کو لاطینی زبان میں منتقل کیا، اقلیدس کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا، جابر بن افلح کی علم النجوم پر ایک کتاب اور یحیی بن سرابی کی کتاب الادویہ کے تراجم کیے، کہا جاتا ہے کہ اس نے مختلف علوم کی ستر سے زیادہ کتابوں کے ترجمے کیے، جن کے اصل عربی متن نایاب ہوگئے، اور ان کے لاطینی تراجم محفوظ رہے۔ (۲)

رابرٹ آف تشتر:

یہ کیٹن کا رہنے والا تھا، اس نے تشتر جا کر علم حاصل کیا اور اسی نسبت سے مشہور ہوا، اندلس جا کر علوم عربیہ میں کمال حاصل کیا، اس کی ملاقات پطرس محترم سے ہوئی، تو اس نے علم نجوم وغیرہ کو چھوڑ کر قرآن کریم کا لاطینی زبان میں ترجمہ کرنے کی ترغیب دی، جس پر اس نے یہ کام انجام دیا، ۱۱۴۴ء میں خوارزمی کی الجبرے کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا، اس نے علم الکیمیا کی ایک قدیم کتاب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ (۳)

ایڈلرڈ آف باتھ:

اپنی ابتدائی عمر میں شام اور ہسپانیہ گیا، اور عربی علوم وآداب سیکھے، عربی علوم میں مہارت کے ناتے اس کو ہنری کا اتالیق مقرر کیا گیا، جو بعد میں ہنری دوم کے لقب سے

۱۔ اضواء علی الاستشراق والمستشرقین: ص: ۲۳: مطبع سابق۔

۲۔ اضواء علی الاستشراق والمستشرقین: ص: ۲۴: مطبع سابق۔

۳۔ الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری: ص: ۵۵: مطبوعہ قاہرہ: ۱۹۹۵ء۔

برطانیہ کا بادشاہ بنا۔(۱)

ہرمان الدلماطی:

یہ رابرٹ آف تشتر مذکور کا رہبانیت، تعلیم اور تراجم میں ہم سفر تھا، یہ کلیسا کے مختلف عہدوں پر فائز رہا، ۱۱۴۳ء میں استدرجہ کا اسقف مقرر رہا۔(۲)

مائیکل اسکاٹ:

یہ اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا، اور اس کا تعلق بھی وینس راہبوں سے تھا، پیرس یونیورسٹی میں ریاضی کی تعلیم حاصل کی، ارسطو کی کتاب الحیوان کا ترجمہ کیا، سسلی میں فریڈرک دوم کے قائم کردہ دارالترجمہ میں کام کیا۔(۳)

راجر بیکن:

یہ انگلستان کا باشندہ تھا، پیرس میں علم نجوم اور علم کیمیا حاصل کیا، اور ابن الہیثم کی کتابوں کا زبردست مطالعہ کیا، جس کے نتیجے میں وہ مائکرواسکوپ ایجاد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔(۴)

ان مستشرقین کے علاوہ ریمنڈلل [۱۲۳۵-۱۳۱۶ء]، فریڈرک ثانی شاہ سسلی [۱۲۲۰ء-۱۲۳۶ء]، اور الفانسو دھم شاہ قشتالہ [۱۲۵۴ء-۱۲۸۴ء] بھی اس دور کے اہم مستشرقین شمار کیے جاتے ہیں۔

اس دور کے اہم ادارے

طلیطلہ کا دارالترجمہ:

طلیطلہ کے رئیس الاساقفہ ڈان ریمنڈ نے ۱۱۳۰ء میں طلیطلہ کا دارالترجمہ قائم کیا، اس دارالترجمہ میں مسلم، عیسائی، اور یہودی علمانے ریاضی، فلک، طب، کیمیا، طبعیات، تاریخ، نفسیات، اور سیاسیات کی اہم کتابوں کے ترجمے لاطینی زبان میں کیے، اس ادارے

۱۔ الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری: ص:۵۶: مطبوعہ قاہرہ: ۱۹۹۵ء۔

۲۔ الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری: ص:۵۵: مطبوعہ قاہرہ: ۱۹۹۵ء۔

۳۔ الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری: ص:۵۵: مطبوعہ قاہرہ: ۱۹۹۵ء۔

۴۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری: ص:۳۵: مطبع سابق۔

کے اہم مترجمین میں جون ثالث، یوحنا بن داؤد اندلسی، یوحنا اشبیلی، رابرٹ آف تشتر، ہرمان الدلماطی کے اسما قابل ذکر ہیں۔(۱)

دیر کلونی:

اس کی بنیاد فرانس میں ۹۱۰ء میں رکھی گئی، اور اس سے ایک اصلاحی تحریک اٹھی، جس نے یورپ بھر کی عیسائیت پر اپنے اثرات چھوڑے،(۲) اس کا رئیس پطرس محترم تھا، اس دیر کے کئی راہب پاپائے روم کے منصب پر فائز ہوئے۔(۳)

یوں ہی ۱۱۳۰ء میں طلیطلہ کے ایک فاضل ڈریمونڈ نے ایک محکمہ اسلامی فلسفیانہ تصانیف کو عربی سے لاطینی میں منتقل کرنے کے لیے قائم کیا، اس محکمے میں بہت سے یہودی عالم شامل تھے۔(۴)

مدرسہ میرامار:

رائمنڈ لیون نے کئی سال اس مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دیے، کئی راہبوں نے اس مدرسہ سے عربی علوم حاصل کیے، اس کام میں رائمنڈ مارٹینی بھی رائمنڈ لیون کی معاونت کرتا رہا، فرانسکسن راہب 'دی لیرا' نے چودھویں صدی عیسوی میں اس مدرسے کو جدید بنیادوں پر استوار کیا۔(۵)

ان کے علاوہ ۱۲۵۰ء میں اشبیلیہ، ۱۲۵۹ء میں بارسلونا، ۱۲۷۶ء میں میورقہ، ۱۲۸۲ء میں بلنسیہ اور ۱۲۹۱ء میں جنیوا میں مدارس قائم ہوئے، ان میں بلنسیہ کا مدرسہ بہت مشہور ہوا، علاوہ ازیں بالمامرید، اور بلد الولید کی یونیورسٹیاں بہت مشہور رہیں۔(۶)

۱۔ ملخصاً اضواء علی الاستشراق والمستشرقین: ص: ۱۸ بحوالہ ضیاء النبی: ۶/ ۱۳۳؛ مطبع سابق۔

۲۔ ملخصاً اضواء علی الاستشراق والمستشرقین: ص: ۱۸ بحوالہ ضیاء النبی: ۶/ ۱۳۳؛ مطبع سابق۔

۳۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۳۳؛ مطبع سابق۔

۴۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۱۲، ۱۳؛ مطبع سابق۔

۵۔ اضواء علی الاستشراق والمستشرقین: ص: ۱۸ بحوالہ ضیاء النبی: ۶/ ۱۳۹؛ مطبع سابق۔

۶۔ اضواء علی الاستشراق والمستشرقین: ص: ۱۸ بحوالہ ضیاء النبی: ۶/ ۱۳۳؛ مطبع سابق۔

اس دور کی اہم استشراقی سرگرمیاں

☆ایک یہودی عالم ابراہیم بن عذراء نے انگلستان پہونچ کر علوم اسلامیہ کے مطالعہ کی اہمیت وضرورت پر توجہ دلائی۔

☆ گیری رڈوی کریمونا [م ۱۱۸۷ء] نے رازی اور ابن سینا وغیرہ کی تقریباً ساٹھ کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

☆یورپی ممالک بالخصوص انگلستان کے علما نے اسپین کی عرب درسگاہوں میں آنا شروع کیا، جن میں ایڈیلرڈ کا نام سرفہرست ہے۔

☆ میکل اسکاٹ نے سسلی میں اسلامی علوم کی تحصیل کی ،اور ارسطو کی تصانیف کا عربی میں ترجمہ کرنے میں عمر گذار دی۔

☆ پوپ جان نے ۱۳۴۵ء میں ایک منشور کے ذریعہ اپنے نمائندے کو پیرس میں ہدایت کی کہ کالج کے عربی شعبے کی نگرانی میں غفلت نہ برتی جائے۔(۱)

۲-دوسرا دور

دوسرے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب صلیبی جنگوں میں پے در پے شکستوں نے دنیائے نصرانیت کو اسلام دشمنی میں پاگل پن کی حد تک پہنچادیا تھا،اور وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف نت نئے انداز میں زہر اگل رہے تھے۔(۲)

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''مستشرقین کی علمی سرگرمیوں کے دوسرے دور کی ابتدا صلیبی جنگوں سے ہوتی ہے، جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، صلیبی جنگ کے بعد مستشرقین کے طرز فکر اور انداز تحقیق میں بنیادی تبدیلی رونما ہوگئی، اب اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ اور اسلامی تہذیب کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا، جو ان کے متعصبانہ افکار کی زد میں نہ آگیا ہو،انھوں نے اپنی

۱۔ ملخصا اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۱۱، ۱۲؛ مطبع سابق۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۳۰؛ مطبع سابق۔

ساری صلاحیتوں کا رخ اسلام کو غیر مہذب اور وحشیانہ مذہب ثابت کرنے کی طرف موڑ دیا، کتنے ہی غلط اور بے بنیاد الزام تھے، جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے اس دور میں تراشے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا حکم اسی زمانہ میں مستشرقین نے وضع کیا، اور اس کو اس طرح مشہور کیا کہ اپنے پرائے سب کو اس کی صداقت پر یقین آ گیا، اسی زمانہ میں یورپ نے مسلمانوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے ان کے متعلق گمراہ کن خیالات قومی گیتوں میں اس طرح سمو دیا کہ یہ جنگی معرکوں میں رجز کی طرح گائے جانے لگے، اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ جب کسی شخص کو عیسائی بنایا جاتا تھا تو یہ خیالات عقائد کے طور پر اس کو سکھائے جاتے تھے، مستشرقین نے اسلام کی جو غلط تصویر اس دور میں پیش کر دی تھی، وہ مدتوں تک یورپ اور اس کے زیر اثر علاقوں میں تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کی جاتی رہی۔" (۱)

پہلے دور اور دوسرے دور میں فرق یہ ہے کہ پہلے دور کے مستشرقین اسلام پر اعتراض کرنے کے لیے اسلام کی تاریخ اور تعلیمات ہی میں اعتراض کی بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے، جب کہ دوسرے دور کے مستشرقین کا تکیہ صرف اپنے تخیل کی پرواز پر تھا، انھیں اسلام کے خلاف لکھنے کے لیے نہ عربی سیکھنے کی ضرورت تھی، اور نہ دین اسلام کی تعلیمات کی حقیقت سے آگاہ ہونا ان کے لیے ضروری تھا، وہ تو اسلام کو سب سے بڑی برائی سمجھتے تھے، اور پیغمبر اسلام کو ہر برائی کا منبع سمجھتے تھے۔ (۲)

تیسرا دور

اس دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب مغرب مضبوط اور عالم اسلام کمزور ہو چکا تھا، اور مغربی طاقتیں استعماری اور استبدادی عزائم کے ساتھ مشرق کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ (۳)

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۱۳؛ مطبع سابق۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۴۱۔

۳۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۴۵۔

مغرب کے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ پہلے مشرق کے مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، دینی، اخلاقی اور معاشی حالات کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور ان خزانوں کا پتہ لگا کر جمع کیا جائے جن کے سہارے مسلمانوں نے بلندی کا آسمان چھوا تھا، اس کے لیے کرایے کے کچھ ایسے ٹٹوؤں کی ضرورت تھی، جو عالم کا بھیس بنا کر مشرق کی جاسوسی کریں اور استعمار پسند طاقتوں کے عزائم کی تکمیل کی راہ ہموار کریں، چنانچہ اس اہم کام کے لیے استعمار پسند طاقتوں نے مستشرقین کا انتخاب کیا، مستشرقین نے اپنے آقایان نعمت کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے رات دن ایک کر دیے، ان کے لیے بلادِ شرقیہ کے ایک ایک خطے کا مطالعہ کیا، وہاں کے باشندوں کی کمزوریوں کا پتہ لگایا، ان کے اندر ودیعت کردہ خوبیوں کو ختم کرنے کے لیے منصوبے تیار کیے، گویا مستشرقین نے اس عظیم کام کے لیے فکری مواد فراہم کیا، جس کے سہارے مغرب کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

اسی دور میں فرانس، ہالینڈ، جرمن، انگلینڈ، اور دوسرے یورپی ممالک میں بڑے مشہور مستشرق ظاہر ہوئے، جنھوں نے عالم اسلام پر اہل مغرب کے استعماری تسلط کا راستہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔(۱)

اس دور میں مستشرقین کے اہم کارنامے

اس دور میں مستشرقین نے جو عظیم کارنامے انجام دیے، ان میں سب سے بڑا کارنامہ نایاب کتابوں اور مخطوطوں کا جمع کرنا ہے، چنانچہ ڈاکٹر منجن نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک مشرق قریب سے بے شمار مخطوطات جمع کیے، اور پھر دوسرے لوگوں کے جمع کردہ مخطوطات کے ساتھ ملا کر ان کی ایک فہرست تیار کی، اسی طرح مارگولیتھ نے بھی مخطوطات کی ایک فہرست تیار کی، برلن، پیرس، سیلانو، روم، لندن، لیزج، لیڈن، آکسفورڈ، کیمبرج، میونخ، ڈبلن، ایڈنبرا، لینن گراڈ، برٹش، ایشیاٹک سوسائٹی اور اسکوریال کی لائبریریاں مخطوطات کی شکل میں مسلمانوں کے علمی ورثے سے بھری پڑی ہیں۔(۲)

۱۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۴۵۔

۲۔ الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری، ص: ۲۳؛ مطبع سابق۔

۱۶۷۱ء میں فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم نے تمام اسلامی ممالک سے مخطوطات خریدنے کے لیے اپنے کارندے بھیجے، اور انھیں فرانس کے تمام سفارت خانوں کے نام یہ شاہی فرمان لکھ کر دیا کہ تمام سفارت خانے اپنے مالی اور افرادی وسائل کو اس مقصد کے لیے استعمال کریں۔(۱)

مذکورہ بالا لائبریریوں میں اڑھائی لاکھ کے قریب مخطوطے ہیں، اور ان کو طاق نسیان کی زینت نہیں بنایا گیا، بلکہ بے شمار عالم اس علمی ورثے کی فہرستیں مرتب کرنے، مخطوطات کو ترتیب دینے، ان مخطوطات کی افادیت اور اوصاف کی تفصیلات تحریر کرنے اور مصنفین کے حالات زندگی مرتب کرنے کے کام پر مامور ہیں، چنانچہ "بودلی" کی لائبریری مخطوطات کے لیے خصوصی طور پر مشہور ہے، یہ لائبریری ۱۶۰۳ء میں قائم ہوئی، اور اس میں ۳۲۷۴ مخطوطے ہیں۔(۲)

ڈاکٹر مصطفی صادق رافعی کے مطابق انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مستشرقین کے ذریعہ جمع کیے گئے مخطوطوں کی تعداد باون ہزار جلدوں تک پہونچ چکی تھی، جس میں آج تک اضافہ ہی ہو رہا ہے۔(۳)

اس دور کے عظیم کارناموں میں ایک یہ بھی ہے کہ "مستشرقین نے مسلمانوں کی کتابوں کے مغربی زبانوں میں ترجمے کرکے شائع کیے اور عربی علمی مصادر کو اصل شکل میں بھی شائع کیا، چنانچہ جغرافیہ میں محمد بن جابر کی 'صورۃ الارض'، ابوالفداء کی 'جغرافیہ ابوالفداء'، رحلہ- ابن جبیر اور یعقوبی کی 'البلدان'، منصور کی 'اخبار الملوک'، ابن العبری کی 'مختصر الدول'، مسعودی کی 'مروج الذہب'، ابن اثیر الجزری کی 'تاریخ الدول الاتابکیہ'، طب میں ابن عوام کی 'اسماء النباتات المختلفۃ'، ابن ابی صیبعہ کی 'طبقات الاطبا'، ابن میمون کی 'رسالہ فی السموم'، ریاضی اور فلسفہ میں 'مخطوطات الریاضیین الاسلامیین'، 'الریاضیون المسلمون' اور 'رسالہ حی

۱۔ضیاء النبی: ۶/ ۱۵۶؛ مطبع سابق۔

۲۔ الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری، ص: ۲۴؛ مطبع سابق۔

۳۔ الاستشراق والمستشرقون، ص: ۱۶، ۱۷؛ مطبوعہ دار النھال، بیروت۔

ابن یقظانؔ وغیرہ اس دور میں مستشرقین کی شائع کردہ اہم کتابیں ہیں۔(۱)

ان قابل قدر کارناموں میں یونانی اور عربی زبان کی تدریس کے شعبوں کا قیام عمل میں لانا ہے، چنانچہ ۱۵۳۹ء میں فرانسو اول نے پیرس میں کالج آف فرانس کی بنیاد رکھی، اور اس میں عربی اور یونانی کی تدریس کے شعبے قائم کیے، ۱۵۸۷ء میں ہنری ششم نے کالج آف فرانس میں عربی کے شعبے کو نئی بنیادوں پر استوار کیا، لندن، پیرس اور برلن کے مدارس عربی کی تدریس کے لیے مشہور ہیں، ۱۹۶۷ء میں امریکہ میں ساٹھ یونیورسٹیاں، چالیس لائبریریاں اور اٹھارہ مراکز تھے، جو مشرق وسطیٰ کے امور کی تدریس میں مشغول تھے۔(۲)

اس دور کے اہم مستشرقین

وہ مستشرقین جنھوں نے اس دور میں السنۂ شرقیہ خصوصاً عربی زبان وادب کی نشر و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا، ان میں گلیوم پوسٹل، تھامس ارپینیس، تھام جرپوز، ابراہام ویلوک، صموئیل کلارک، اور برائن ولٹن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔(۳)

اسی دور میں جرمنی میں ریسکے [م ۱۷۷۴م] سویزرلینڈ میں بورہرڈ [م ۱۸۱۷ء] اور برطانیہ میں ایڈورڈ پوکاک نے تحریک استشراق کی ترقی کے لیے سخت محنت کی۔(۴)

یوں ہی فرانس میں سلولیز دی ساسی، ہالینڈ میں ڈوزی، انگلستان میں رابرٹ اسمتھ اسلامی تاریخ اور ادب پر تصانیف کے انبار لگادیے۔(۵)

اس دور میں مستشرقین کی اہم سرگرمیاں

☆ جارج سیل نے قرآن حکیم کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو یوروپی زبانوں میں قرآن کا پہلا مکمل ترجمہ تھا۔

☆ ۱۷۹۸ء کے بعد نپولین نے مصر کے علمی ذخیروں کو فرانس منتقل کرنا شروع کیا۔

۱۔ الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری: ص: ۱۷، مطبع سابق۔

۲۔ الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری: ص: ۲۰۳، مطبع سابق۔

۳۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۵۷، مطبع سابق۔

۴۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری: ص: ۴۸، مطبع سابق۔

۵۔ اسلام اور مستشرقین: ۳/ ۱۴، مطبع سابق۔

☆ہندوستان، انڈونیشیا، ایران، مصر، شام اور عراق کے کتنے ہی انمول موتی یورپین کتب خانوں کی زینت بن گئے۔

☆نپولین نے مصلحۃً سائٹھ علمائے ازہر کے سامنے اسلام سے اپنے جھوٹے احترام کا اعلان کیا۔(۱)

یہ دور مذکورہ دونوں دوروں سے زیادہ خطرناک تھا، بلکہ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی: ''اس دور کے مستشرقین نے زہر کی تلخیوں کو تحقیق کے شہد میں اس طرح چھپایا کہ کام ودہن کو تو تلخی محسوس نہیں ہوئی، لیکن زہر رگ وپے میں اتر گیا۔''(۲)

تحریک استشراق کا چوتھا دور

اس دور کا تعلق اس زمانے کے ساتھ ہے، جب نوآبادیات کے باشندے غیر ملکی تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے استعماری طاقتوں کو اپنے اپنے ممالک سے نکالنے کی جدوجہد شروع کردی تھی۔(۳)

اس دور کے مستشرقین کے انداز بحث وتحقیق میں ایک عجیب تبدیلی رونما ہوئی چنانچہ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''جب نوآبادیاتی نظام کا دم واپسیں شروع ہوا، اور اسلامی ممالک میں آزادی کی تحریکیں نمودار ہونے لگیں تو مستشرقین کے انداز تحقیق اور طریقۂ کار میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوگئی، نوآبادیوں کی آزادی کو ٹالنا اب ممکن نہ رہا تھا، لیکن ان سے بے تعلق ہوجانا ملک کے سیاسی اقتدار پر ضرب کاری کے مترادف تھا، چنانچہ اب تمدنی رشتوں کی نئی زنجیریں وضع کرنے کے لیے اسلامی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہوگیا۔''(۴)

۱۔اسلام اور مستشرقین:۲/ ۱۵؛مطبع سابق۔

۲۔اسلام اور مستشرقین:۲/ ۱۵؛مطبع سابق۔

۳۔ضیاء النبی:۶/ ۱۳۰؛مطبع سابق۔

۴۔اسلام اور مستشرقین:۶/ ۱۵؛مطبع سابق۔

اب مستشرقین نے اپنے مقاصد کی حصولیابی کے لیے طریقہ کار یہ اختیار کیا کہ انھوں نے اپنے پیش رووں کی اسلام مخالف تحریروں پر جرح اور تنقید شروع کر دی اور اسلام کے بارے میں ایسی کتابیں لکھنی شروع کر دیں، جن میں اسلام کے کچھ شعبوں کی تعریف بھی کی گئی ہوتی، اس طرح وہ ایک طرف مسلمانوں کی حمایت تو حاصل کر ہی رہے تھے، دوسری طرف تعریف کی آڑ میں کچھ ایسی باتیں بھی کہہ دیا کرتے تھے، جو اسلام کے خلاف ہوتی تھیں، پھر بھی سادہ لوح مسلمان اسے بسروچشم قبول کر لیتے تھے، اس تبدیلی کے اسباب وعوامل کی تفصیل علامہ پیر کرم شاہ ازہری کی زبان قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

''اب جب طویل غلامی کے بعد مسلمانوں کے آزاد ضمیر نے انگڑائی لینا شروع کیا، انھوں نے غلامی پر موت کو ترجیح دینے کے بارے میں سوچنا شروع کیا، اور ان میں ایسے مردان حق پیدا ہوئے، جنھوں نے سلطان ٹیپو شہید کی روح کو سلام کرتے ہوئے یہ نعرہ لگایا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' تو استعماری طاقتیں ایک نئی صورت حال سے دوچار ہو گئیں، اب ان کے لیے صرف دو راستے رہ گئے تھے، ایک راستہ تو یہ تھا کہ آزادی کی اٹھتی ہوئی تحریک کو بزور شمشیر کچل دیں، اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے علاقوں کو خالی کر کے اپنے ممالک واپس چلے جائیں۔

پہلے راستے کو اختیار کرنے کی ان میں جرأت نہ تھی، وہ مسلمانوں کو میدان جنگ میں آزما چکے تھے اور انھیں یقین تھا کہ یہ قوم موت کو خاطر میں نہیں لاتی ہے، صلیبی جنگوں کے ہولناک مناظر انھیں اس راستے کو اختیار کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے، اس کے لیے انھوں نے نوآبادیات کو آزادی دینے کا فیصلہ کر لیا، لیکن جن علاقوں پر انھوں نے اتنا عرصہ حکومت کی تھی، انھیں یوں ہی چھوڑ کر چلے جانا آسان نہ تھا، وہ اب تک مسلمانوں کے حکمراں تھے اور مسلمانوں کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے، لیکن اب انھوں نے مسلمانوں کی خیر خواہی اور دوستی کا لبادہ اوڑھ لیا، انھوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کو جسمانی طور پر ان کے غلبے سے آزاد ہو کر بھی ان کی ذہنی غلامی سے آزاد نہ ہونے پائے۔

اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ ایسی تمام چیزیں جو مسلمانوں کے دلوں میں اہل

مغرب کے خلاف نفرت پیدا کرتی تھیں، ان کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش کی جائے، ان کے پیش رووں نے کئی سو سال تک اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف زہر اگلا تھا، عیسائیوں سے مسلمانوں کو متنفر کرنے کے لیے یہ کتابیں بہت خطرناک ہو سکتی تھیں، اس لیے تحریک کے گرگٹوں نے ایک رنگ بدلا، اب ایسے مصنفین منظر عام پر آنے لگے، جنھوں نے اپنے پیش رووں کی تحریروں پر شدید تنقید کی، انھوں نے اسلام کے بارے میں ایسی کتابیں لکھنا شروع کیں، جن میں اسلام کے کچھ شعبوں کی تعریف کی گئی تھی۔" (۱)

اس دور کے اہم مستشرقین

اس عہد کے مستشرقین میں منٹگمری واٹ اور تھامس کارلائل کے نام قابل ذکر ہیں، عیسائیت ہی نہیں اسلام میں بھی ان کو بڑا احترام دیا جاتا ہے، ان کو منصف اور غیر جانب دار محقق کہا جاتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان مستشرقین نے اپنا اصل مکھوٹا چھپانے کے لیے بھلے ہی سو جتن کیے پھر بھی ان کے دل میں پوشیدہ اسلام کے خلاف بغض وعناد منصۂ شہود پر آنے سے رہ نہ سکا، چنانچہ تھامس کارلائل نے قرآن حکیم کو دنیا کی سب سے بور کتاب کہا، اور منٹگمری واٹ نے اپنی کتاب 'محمد ایٹ مکہ' اور 'محمد ایٹ مدینہ' میں رحمت عالم ﷺ کی سیرت طیبہ پر زبردست کیچڑ اچھالا ہے، ایسے میں شکوہ غیروں سے نہیں بلکہ اپنوں سے ہے جو ان متعصب مستشرقین کو انصاف پسندی اور معتدل مزاجی کے اوصاف سے متصف کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔

اس دور کی اہم استشراقی سرگرمیاں

انگلستان میں 'اسکار بروز رپورٹ تیار ہوئی، جس کو بجا طور پر استشراق جدید کا منشور کہا جا سکتا ہے، اس رپورٹ میں اس بات کا شدید احساس ملتا ہے کہ اگر نئے ابھرتے ہوئے مشرق کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا تو برطانوی مقاصد بری طرح متاثر ہوں گے، ان مقاصد کو 'امن عالم' کا معصوم نام دیا گیا ہے، لیکن سامراجی جذبات، افکار کا نیا چولہ بدل کر اس رپورٹ کے ایک ایک حرف سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ (۲)

۱۔ضیاء النبی: ۶/ ۱۶۵؛ مطبع سابق۔

۲۔روز گار فقیر، ص: ۱۳۵ بحوالہ اسلام اور مستشرقین: ۶/ ۱۶؛ مطبع سابق۔

اسی دور میں مستشرقین کھل کر اپنی حکومتوں کے دست راست بن گئے، چنانچہ وہ اپنے ملک کی وزارت خارجہ کے مشیر بنے، اور انھوں نے اپنے وسیع تجربے اور مطالعے سے فائدہ اٹھا کر ایسی پالیسیاں وضع کیں کہ استعماری طاقتوں کے چلے جانے کے بعد بھی مسلمان ان کی ضرورت محسوس کریں۔

اس دور میں سب سے خطرناک کام یہ ہوا کہ مستشرقین نے بڑی چابک دستی سے مسلم مدارس ومکاتب میں ایسے نصاب رائج کروائے، جس نے مسلمانوں کو کلی طور سے تو نہیں پر جزوی طور سے ان کے روایتی علوم سے علاحدہ کر دیا، اس خطرناک اقدام کے اثرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں، چنانچہ آج بہت سارے مسلم بچے ملیں گے، جنھیں انگریزی، جغرافیہ اور سائنس میں تبحر حاصل ہوگا، لیکن علوم اسلامیہ میں ان کی جانکاری نہ کے برابر ہوگی۔

تحریک استشراق کا پانچواں دور

اس دور کا تعلق اس زمانے سے ہے، جب قدرت نے عالم اسلام کو زر سیال کی دولت سے مالا مال کیا، اور اہل مغرب کی حریص نگاہیں اس دولت خداداد پر مرکوز ہوگئیں۔(۱)

مستشرقین کے حاشیۂ خیال میں بھی ایسی صورت حال نہیں تھی، اسلامی ممالک کی اقتصادی آزادی کے خیال نے ان کی استعمارانہ فکر کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے، نئی صورت حال کے امکانات ان کے لیے تشویش بلکہ توحش کا باعث بن گئے، اب مستشرقین کی دل چسپی جدید مذہبی تحریکات، سماجی رجحانات اور اقتصادی امکانات کے مطالعہ کی طرف منتقل ہوچکی ہے، اور فکر اسلامی کی توجیہ اور تعلیل سے زیادہ مسلمانوں کے اندرونی اور بیرونی حالات کے تجزیے کی طرف توجہ ہے، اقتصادیات، سیاست ارضی Geopolitic اور عمرانیات سے قریب لا کر دینی عناصر کے مطالعہ سے گریز کیا جانے لگا، چنانچہ اسی دور میں ۱۹۶۶ء میں امریکہ میں The Middle East Studies Association of North America اور ۱۹۷۶ء میں British Society for

---

۱۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۳۰؛ مطبع سابق۔

Mid-eastern Studies کا قیام عمل میں آیا، یہ انجمنیں بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات کی آئینہ دار ہیں، ان مطبوعات اور رسائل سے ان کی ذہنی خلشوں کا اندازہ ہوتا ہے، جن سے مستشرقین اس وقت دوچار ہیں۔(۱)

اس دور میں مستشرقین کے مطالعے کا انداز بدل گیا، چنانچہ اب مستشرقین نے اسلام کے روایتی مطالعہ پر توجہ کم کردی، اور دور حاضر کے مسلمان معاشرے میں پائے جانے والے رجحانات کا تفصیلی مطالعہ شروع کردیا، اب ان کے مطالعہ کا مرکز توجہ پورا مشرق نہ تھا، بلکہ صرف وہ ممالک تھے، جہاں قدرت نے تیل کے وافر ذخائر پیدا فرمادیے تھے، اب مستشرقین نے ایشیائی سوسائٹیوں کے بجائے مشرق وسطیٰ کے نام سے سوسائٹیاں قائم کرنا شروع کردیں۔(۲)

تحریک استشراق کا چھٹا دور

اس دور کا تعلق عہد حاضر سے ہے، اس دور میں مستشرقین ایک عجیب کشمکش سے دوچار ہیں، وہ ساری کوششیں جو انھوں نے مسلمانوں کو تباہی کے گڑھے میں پھینکنے کے لیے کی تھیں، وہ سب بے کار ثابت ہورہی ہیں، اس دور میں اسلامی تحریکیں زور پکڑنے لگیں، جو ممالک اسلامیہ استعماری تسلط سے آزاد ہوئے، ان ممالک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبے شروع ہوگئے، برصغیر، مصر اور افریقہ کے مسلم ممالک میں ایسی تحریکوں نے زور پکڑا، افغانستان اور ایران کے مسلمان اپنے دوسرے ملی بھائیوں سے بھی چند قدم آگے تھے۔

مستشرقین ایک مرتبہ پھر استشراقی، صہیونی، تبشیری اور استعماری آرزوؤں کے محل کی حفاظت کے لیے میدان میں آگئے، انھوں نے مسلمانوں کے لیے 'دہشت گرد' اور 'بنیاد پرست' کی اصطلاحیں ایجاد کیں، الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ ان اصطلاحوں کی اتنی تشہیر کی گئی کہ مسلمان زعما کی زبانوں سے بھی بنیاد پرستی کی مذمت ہونے لگی، مسلمانوں کا طبقہ دہشت

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۶/ ۱۷؛ مطبع سابق۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۶۸؛ مطبع سابق۔

گردی کے الزام سے بچنے کے لیے اپنے مسلمان ہونے پر شرمندگی محسوس کرنے لگا، مختلف اسلامی ممالک میں اسلام کے حق میں اٹھنے والی آوازوں کو کچلا گیا، اسلام کا نام لینے کے جرم میں عراق وایران کو سارے مغرب کا سب سے بڑا دشمن سمجھا گیا، مسلمانوں کی طرف سے ایٹم بم بنانے کی کوشش کو اسلامی بم بنانے کا نام دیا گیا، اور عراق کے ایٹمی پلانٹ پر حملہ کیا گیا۔

اسی دور میں امریکی دادا گیری کا آغاز ہوا، فرعون وقت 'بش' اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان اور پھر عراق پر دہشت گردی کے خاتمے کے نام پر فوجی حملے کیے، جس کے نتیجے میں ان دونوں ممالک کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہو کر رہ گئی، علاوہ ازیں اسرائیلی دہشت گردی کی ابتدا بھی اسی عہد میں ہوئی، جس کے نتیجے میں فلسطینی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، اس طرح سے یہ دور سابقہ تمام ادوار سے زیادہ خطرناک دور ہے، اس دور میں بھی مستشرقین امریکہ اور اسرائیل کے دست راست بنے ہوئے ہیں، ان کے لیے اسلامی ممالک میں جا جا کر جاسوسی کر رہے ہیں، اور میڈیا کے ذریعہ مسلمانوں کی شبیہ کو داغ دار کرنے میں شب و روز ایک کیے ہوئے ہیں۔(۱)

۱۔ضیاء النبی: ۶/ ۱۷۱؛ مطبع سابق۔

تحریک استشراق کی تاریخ عہد بہ عہد

جیسا کہ پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ عملی طور سے تحریک استشراق کی ابتدا اکثر محققین کے نزدیک آٹھویں صدی عیسوی میں ہو چکی تھی، اس تحریک کا موسس اول جان آف دمشق ہے، [۷۰۰ یا ۷۴۹ء] آٹھویں صدی عیسوی میں جان کے پیروؤں نے جان کے وضع کردہ خطوط پر اسلام دشمن لٹریچر کا انبار کھڑا کر دیا، اسلام دشمن ادب کے اسی انبار سے ایک نامی گرامی رسالہ قابل ذکر ہے، یہ رسالہ عبدالمسیح بن اسحق الکندی کی طرف منسوب ہے، انیسویں صدی میں ولیم نے اس کا عربی متن پرٹسٹنٹ مشنری اسکول کے استعمال کے لیے ۱۸۸۰ء میں لندن سے شائع کیا، رسالہ کے مرکزی مضامین میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار، قرآن کریم کا مذاق، سیرت محمدیہ کو جنس اور جنگ سے ملوث کرنا اور دیگر خرافات شامل تھے۔

آٹھویں صدی کے اواخر اور نویں صدی کے اوائل میں عروج اسلام پر تھیوسوفین [۷۵۸ء، ۸۱۸ء] نے 'کرانکل' نامی تاریخی کتاب لکھی، اسی کتاب کو اناسٹیسس Ana Stasius نے اپنی تاریخ چرچ کا حصہ بنالیا، اور یہ دونوں کتب مستشرقین کے مصادر بن گئے، 'کرانکل' نامی کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ، ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے، ان کو امی کہنا غلط ہے، اس کا مقصود یہ تھا کہ اگر نبی کریم ﷺ کو تعلیم یافتہ ثابت کر دیا جائے تو پھر منطقی طور سے یہ دعویٰ صحیح ہو جائے گا کہ آپ نے اسلامی عقائد و نظریات یہودی اور عیسائی الہامی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کیے، اسی 'کرانکل' نامی کتاب میں نبی کریم ﷺ پر جنونی دورے کی داستان بھی گڑھی گئی۔

نویں صدی عیسوی میں شاہ بیسل [۸۶۷ء، ۸۸۶ء] کی فرمائش اور حکم پر ایک

برنطینی مولف نے آں حضرت ﷺ کے خلاف ایک کتاب ”Refutation of Mohammad“ لکھی جس میں آپ کو نبی کاذب ثابت کرنے کے لیے ابلیس کا بیٹا قرار دیا گیا، قرآن کو کذب وخرافاتی داستانوں کا مجموعہ قرار دے کر اسے غیر الہامی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، اسلام کے اساسی عقیدہ **”لم یلد ولم یولد“** کا مذاق اڑایا گیا، دسویں اور گیارہویں صدی میں وہی سارے افسانے دہرائے جاتے رہے جو مذکورہ صدیوں میں مستشرقین کے تخیلات کا نتیجہ تھے۔

گیارہویں صدی کے اخیر اور بارہویں صدی کے آغاز سے صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، چنانچہ ۱۰۹۹ء میں صلیب وہلال کا پہلا معرکہ برپا ہوا، ۱۱۴۷ء میں دوسری صلیبی جنگ لڑی گئی، اور تیسری معروف صلیبی جنگ سلطان ایوبی اور رچرڈ کے درمیان ۱۱۸۹ء سے ۱۱۹۳ء تک جاری رہی، چوتھی صلیبی جنگ ۱۲۰۳ء سے ۱۲۰۴ء کے درمیان لڑی گئی، پانچویں ۱۲۱۷ء میں، چھٹی ۱۲۲۸ء میں لڑی گئی، اس کے بعد اہل صلیب اور منگولوں کی متحدہ فوج اور مسلمانوں کے درمیان ساتویں صلیبی جنگ ۱۲۵۸ء میں پیش آئی، جس کے نتیجہ میں زوال بغداد کا واقعہ پیش آیا، آٹھویں صلیبی جنگ ۱۲۷۱ء میں، نویں ۱۳۶۵ء میں اور آخری دسویں جنگ ۱۴۶۴ء میں پیش آئی۔

صلیبی جنگوں کی پانچ سو سالہ تاریخ یعنی گیارہویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی عیسوی تک مستشرقین کی اجمالی تاریخ یہ ہے کہ صلیبی جنگوں میں پے در پے شکست کے بعد صلیبیوں نے قلمی جنگ کا آغاز کیا، جس کے لیے انھوں نے مستشرقین کو اپنی جنگ کا ہراول دستہ بنایا، مستشرقین نے میدان مبارزہ میں نثری ادب کے ساتھ شعری ادب کا بھی بھرپور استعمال کیا، رابرٹ اور ہرمن نامی مولفین نے چار عربی کتب کے تراجم کیے، جن پر پیٹر Peter نامی مستشرق نے مقدمے لکھے، یہ مقدمے خرافات سے مزین تھے، اسی پیٹر کی تحریروں نے یورپ اور اسلام کے درمیان باقاعدہ محاذ آرائی کا دور شروع کیا، اور یہی تحریریں اس دور کے مستشرقین کے لیے مصادر بنی رہیں، والٹر نے لاطینی زبان میں اور الکونڈر نے فرانسیسی زبان میں نبی کریم ﷺ کے خلاف دل کھول کر لکھا، شعری ادب میں ایک مرثیہ کا ذکر ناقابل گزیر ہے، جسے بارہویں صدی کے شاعر امبری آف مینٹ

Embrieo of Maint کے نام سے شائع کیا گیا تھا، اس مرثیہ میں نبی کریم ﷺ کے خلاف نفرت کا ایک امنڈتا ہوا سیلاب موجزن تھا، اس میں آپ ﷺ کے لیے ہر قسم کے غلیظ القابات استعمال کیے گئے تھے، اسی قسم کا ایک مرثیہ بنام 'اویئودی محمدؐ' والٹر نامی مستشرق نے بارہویں صدی کے وسط میں لکھا، جو پہلے مرثیہ کا نقش ثانی تھا۔

معروف مولف گلبرٹ نے بارہویں صدی میں 'گیتا' نامی کتاب لکھی، جس میں آپ ﷺ کے نام کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے محمدؐ کے بجائے 'ماتھوس' لکھا۔

بارہویں صدی کی خرافات نویسوں میں دو ایسے مولفین بھی ملتے ہیں، جنھوں نے مستشرقین سے کچھ ہٹ کر اپنی راہ متعین کی ہے، ان میں ایک ولیم William ہے، جس نے پہلی بار اسلام اور وثنیت میں فرق پیدا کیا، دوسرا مولف الفونسو Alfanso ہے، جو اصلاً یہودی تھا، ۱۱۵۶ء میں مصلحتاً عیسائی بن گیا تھا۔

تیرہویں صدی عیسوی سابقہ ڈگر پر چلتی رہی، ۱۲۷۱ء میں ولیم نے آں حضرت ﷺ کی سوانح حیات لکھی، اس سوانح میں مولف خرافات پیش کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن آپ ﷺ کی وفات کے پندرہ سال بعد مدون ہوا، ۱۲۶۵ء سے ۱۳۲۱ء کے درمیان 'دانتے' کی معروف اور شہرۂ آفاق نظم The Divine Comedy کو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا چراغ راہ تصور کیا جاتا ہے، اس نظم میں دانتے نے پیغمبر اسلام ﷺ کو جہنم میں مبتلائے عذاب دکھایا ہے، اسی کے ساتھ اس نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو منافقین کے ساتھ مبتلائے عذاب دکھلایا ہے، اور صلیبی شہسواروں اور مقتولوں کو فرحاں وشاداں جنت میں عیش کرتے دکھایا ہے۔

تیرہویں صدی عیسوی سے لے کر ۱۵ رویں صدی تک کا زمانہ نشاۃ ثانیہ کا ابتدائی زمانہ تھا، اسی درمیان ۱۷۵۰ء سے ۱۸۳۰ء کے درمیان رومانی تحریک اٹھی، مذہبی تقشف وتعصب کے خلاف نئے مکاتب فکر وجود میں آئے، مگر اسلام کے متعلق مستشرقین کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ نشاۃ ثانیہ کا پورا دور ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات کے زیر اثر رہا، وہی افسانوی اور دیومالائی تعبیر وتفسیر اسلام کا مقدر تھا۔

سترہویں صدی عیسوی نے مستشرقین کے سامنے نئے نئے مسائل کھڑے کردیے،

یہ صدی مغربی استعمار کے عروج کی صدی تھی، عالم اسلام جب انگریز، فرنچ، ڈچ وغیرہ کے قبضہ میں آیا تو مستشرقین نے ان ممالک کا دورہ شروع کیا، انھوں نے وہاں اسلامی تہذیب و کلچر کی شکل میں جو کچھ دیکھا، وہ سب لاطینی و بزنطینی افسانوی اور دیومالائی روایات کے بالکل برخلاف تھیں، اس تضاد نے ان کے سامنے سوالیہ نشانات کھڑے کردیے، اسی اثنا میں استعماری قوتوں نے معاشی لوٹ مار کے ساتھ اسلامی علوم وفنون، مسودات ومخطوطات کے نادر نسخوں کی بھی لوٹ مار شروع کردی، اسی سترہویں صدی میں بعض مستشرقین نے روایتی ڈگر سے ہٹنے کی کوشش بھی کی، ان میں کا ایک آکسفورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر میکاک [م۱۶۹۱ء] تھا، جس نے حقیقت اور افسانہ یا تحریفات کے درمیان فرق پیدا کرنے کی کوشش کی، یوں ہی الیکونڈر راس Alexander Ross نے اپنی کتاب ’پنڈیبلیا‘ Pandeblia {۱۶۵۳ء} میں لاطینی خرافات سے ہٹ کر ایک راہ نکالی، اور اسلام کے بارے میں پہلی بار چند نئے کلمات استعمال کیے، اسی صدی میں ایڈیسن نے Life and Death of Mohammad کے زیر عنوان اپنی ایک کتاب ۱۶۷۸ء میں شائع کی، جس کے مصادر حسب معمول لاطینی خرافات تھے، اسی صدی میں ناروچ کا ڈین مسمی بہ ہمفری نے آپ ﷺ کو نبی کاذب کا خطاب دیا۔

سابقہ صدیوں کے مقابلہ میں اٹھارہویں صدی میں اسلام پر زیادہ لٹریچر تیار ہوا، اس عہد میں بھی ایچ، ریلان H Relan کا نام قابل ذکر ہے، اس نے اپنی معروف تالیف ’مذہب محمد‘ میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا، یوں ہی کانٹ Count نے اپنی کتاب جو لندن سے ۱۷۳۰ء میں شائع ہوئی، اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیا، اسی طرح سیوری Savery نامی مولف نے ۱۷۵۲ء میں قرآن کریم کا فرانسیسی ترجمہ کیا، اور اس میں آپ ﷺ کی مختصر سوانح حیات لکھی، اور آپ ﷺ کے لیے نرمی کے چند الفاظ استعمال کیے، مگر اسی کے ساتھ اس صدی میں کچھ ایسے مستشرقین بھی ملتے ہیں، جنھوں نے اسلام دشمنی کا حق ادا کردیا، جن میں جارج سیل نامی مستشرق قابل ذکر ہے، جس نے آپ ﷺ کو نبی کاذب اور اسلام کو مذہب فاسد قرار دیا، اسی طرح ایڈورڈ گبن جسے انگریزی تاریخ نویسی کا معمار سمجھا جاتا ہے، اس نے

زوال روما کی تاریخ پر لکھی گئی اپنی کتاب میں اسلام اور نبی کریم ﷺ کے خلاف دل کھول کر اپنے بغض وعناد کا اظہار کیا، اور آپ کو لالچی، شہوت پرست، جھوٹا، جاہ طلب اور نہ جانے کیا کیا کہا، اٹھارہویں صدی کا سب سے عظیم مستشرق والیٹر ہے، [۱۶۹۴ء۔۱۷۷۸ء] جس کو فرانسیسی آسمان فکر کا تابندہ ستارہ اور مصلحین کا پیام بر سمجھا جاتا ہے، مگر وہ بھی اپنی اسلام دشمنی کو نہ چھپا سکا اور اپنے ڈرامہ مسمی بہ 'دین محمد' [۱۷۴۲ء] میں اسلام کے خلاف نفرت وحقارت کا اظہار کیا اور اسلام کو وحشی مذہب قرار دینے کے ساتھ آپ ﷺ کو جھوٹا نبی قرار دیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے مستشرقین بھی دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، ایک وہ جنھوں نے اسلام کے خلاف اپنی نفرت کو چھپا کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے تعلق سے نرم رویہ اختیار کیا، دوسرا وہ جو اپنے روایتی تعصب وتنگ نظری پر برقرار رہا، اول الذکر طبقہ میں جرمن شاعر گیٹے کا ذکر ناگزیر ہے، جس نے ۱۷۷۳ء میں آپ ﷺ پر ایک نظم 'ترانہ محمد' لکھی، اور آپ کو ایک چشمہ سے تعبیر کرتے ہوئے وحدۃ الوجود کا مدرس بتایا، اس نے آپ کے لیے احترام کے چند کلمات بھی استعمال کیے، یوں ہی اس باب میں کارلائل کا نام بھی قابل ذکر ہے، جس کا نام ۱۷۹۵ء سے ۱۸۸۱ء تک زندہ رہا، انیسویں صدی کے نصف ثانی میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے حق میں انصاف پسندی کی جو تحریک برپا ہوئی، کارلائل اس کے قائدین میں سے تھا، اس نے اپنے پیش روؤں کے اس دعوے کی زبردست تردید کی کہ آپ نبی کاذب تھے، اسی طرح گستاویل نے آپ ﷺ کی زندگی اور تعلیمات پر ایک کتاب لکھی، جس نے آپ ﷺ کے ساتھ انصاف پسندی کا ثبوت دیا، یوں ہی فرانسیسی مستشرق کاسن دی پرسی ویل نے ۱۸۴۷ء میں تاریخ عرب لکھی، اور اپنے رویے میں نرمی کا مظاہرہ کیا۔

اس صدی میں مستشرقین کا محبوب موضوع اسلام کی اصلیت کا پتہ لگانا رہا، اس تحریک کے سرخیلوں میں تین مستشرقین ولیم میور، اسپرینگر اور نالدیکی کا نام قابل ذکر ہے، اسپرینگر نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے متعلق تین کتابیں لکھیں:

(۱) حیات محمد اصلی مصادر کی روشنی میں؛ جوالہ آباد سے ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی۔

(۲) حیات اور تعلیم محمد: جو تین جلدوں میں ہے، اور برلن سے ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء کے بیچ میں شائع ہوئی، اور

(۳) محمد اور قرآن ایک نفسیاتی مطالعہ: جو ہیمبرگ سے ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی، ان تالیفات میں اسلام کی اصلیت کے اثبات کے عنوان سے بحث کی گئی ہے، واضح رہے کہ یہی اسپرینگر ہے، جس نے اپنی طبی تحقیق کی رو سے آپ ﷺ کو معاذ اللہ مصروع ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

مذکورہ تحریک کا دوسرا سرخیل ولیم میور ہے، جو برطانوی سیول سروس کا ملازم اور کیتھولک عیسائی تھا، اس نے بھی نبی کریم ﷺ کو نبی کاذب قرار دینے کے ساتھ قرآن کو تہذیب، آزادی، اور حق کا بدترین دشمن قرار دیا۔

تیسرا اہم مستشرق جو اسلام کے لیے مذکورہ دونوں مستشرقین سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا، نالدیکی ہے، جس نے تاریخ قرآن نامی کتاب لکھی، جو برلن سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی، اس نے اسپرینگر کے نظریے کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ آپ ﷺ ہذیان یا مرگی کے مریض نہیں تھے، بلکہ آپ جذباتی دورے کے مریض تھے، انھیں جذباتی دوروں کے زیر اثر آپ نے قرآن کریم کی تالیف کر ڈالی۔

بیسویں صدی عیسوی میں مستشرقین نے انکار حدیث کا شوشہ چھوڑا، چنانچہ سب سے پہلے معروف مستشرق گولڈ زیہر نے انکار حدیث کا فتنہ کھڑا کیا اور اپنی تالیف 'دراسات محمدیہ' میں مذکورہ نظریے کی اساس ڈالی۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی میں مستشرقین دو مکتبۂ فکر میں بٹ گئے، ایک انکار حدیث پر مصر رہا، دوسرے نے نئی ابھرتی ہوئی اشتراکی تحریک کی گود میں پناہ لیا، اول الذکر مکتبۂ فکر کے حاملین نے ان احادیث کی فہرست تیار کی، جو خاص قبائل، افراد اور احکام سے متعلق تھیں، گولڈ زیہر نے اس قسم کی تمام احادیث کا انکار کیا، اس صدی میں سیرت اور اس کے مصادر پر بھی خوب کیچڑ اچھالا گیا، چنانچہ خود گولڈ زیہر نے اسلامی اسناد کے پورے سلسلے کو غلط قرار دے کر اعلان کر دیا کہ یہ مصادر لائق اعتماد نہیں ہیں، یوں ہی ہنری لارنس نے مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا، جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ

ہجرت مدینہ سے قبل اسلامی روایت کا سارا ڈھانچہ جس پر آپ ﷺ کی سوانح حیات کھڑی کی گئی ہے، سب بے بنیاد ہے، سب سے دل چسپ تحقیق اس نے یہ پیش کی کہ آپ ﷺ کثیر خوری کے مریض تھے، اور یہی ان کی موت کا سبب بنا، تعجب ہے، وہ مقدس ذات جس نے کئی کئی دن فاقے کیے ہوں، پیٹ پر پتھر بھی باندھے ہوں، اس کے سلسلے میں مذکورہ بالا نظریہ کہاں تک صحیح ہے، اس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

اسی صدی میں اچانک یورپ میں معاشی تحریک نے زور پکڑا، اس طوفان کی زد سے مستشرقین بھی اپنے آپ کو نہ بچا سکے، چنانچہ ہیوبرٹ کریمی نامی جرمن مستشرق نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر دو کتابیں لکھیں، جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام ایک دینی و مذہبی تحریک نہیں تھی، بلکہ ایک سوشل سسٹم تھا اور نبی کریم ﷺ بجائے ایک نبی ہونے کے سماجی مصلح تھے۔

اسی صدی میں مارگولیتھ (۱۸۵۸ء تا ۱۹۴۰ء) کا ظہور ہوا جس نے سماجی اور معاشی تحریک کے ساتھ سیاسی تحریک کو بھی موضوع بحث بنایا، چنانچہ اپنی کتاب 'محمد اور عروج اسلام' میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آپ ﷺ ایک سیاسی ہیرو تھے، جو اپنی ذہانت اور فطری صلاحیت سے ایک عظیم سلطنت کے بانی بن گئے۔

اسی صدی میں مذہبیات کے مطالعہ میں علم النفس کے اصول کے استعمال کی تحریک نے جنم لیا، دین فرانز بھل اور طور اینڈرے اس تحریک کے قافلۂ سالار تھے، ان دونوں میں سے بھل نے اپنی تحقیق کی روشنی میں ثابت کیا کہ آپ ﷺ غیر معمولی اعصابی سسٹم کی وجہ سے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے عادی ہوگیے تھے کہ آپ پر وحی کا نزول ہوتا ہے، طور لینڈرے نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام یہودیت اور نصرانیت کا معجون مرکب ہے۔

اس صدی میں کچھ ایسے مستشرقین بھی موجود تھے، جنھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے تعلق سے نرم رویہ اپنایا، جن میں کارلائل اور بوسورتھ اسمتھ کے اسما قابل ذکر ہیں، چنانچہ اسمتھ نے اپنی کتاب 'محمد اور محمد زم' میں آپ ﷺ کو ایک عظیم فرد تسلیم کیا ہے، یوں ہی الفونس نامی مستشرق نے ۱۹۲۰ عیسوی میں پیرس سے شائع ہونے والی کتاب 'اللہ کے نبی محمد

کی حیات' میں رواداری کا ثبوت دیا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کا عظیم ترین مستشرق سر ہملٹن گب کو سمجھا جاتا ہے، اگرچہ موصوف مسلمانوں اور مستشرقین میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، مگر وہ بھی اپنے آپ کو روایتی تعصب وعناد سے نہیں بچا سکے، چنانچہ انھوں نے اپنی تالیف 'اسلام میں جدید رجحانات' ۱۹۴۷ء میں اسلام کے بارے میں بے حد دل سوز باتیں تحریر کیں۔

اسی زمانے میں منٹگمری واٹ نامی مستشرق کا خوب چرچا ہوا، ان کی تین معروف تالیفات 'محمد ایٹ مکہ' ۱۹۵۳ء 'محمد ایٹ مدینہ' ۱۹۵۶ء اور 'محمد من حیث نبی اور اسٹیٹ مین' ۱۹۶۱ء کی خوب دھوم مچی، ان تالیفات میں موصوف نے آپ ﷺ کی نبوت اور اخلاص ولگن کو ضرور سلامی دی ہے، لیکن قرآن کو منزل من اللہ ہونے کی حیثیت نہیں دی ہے۔(۱)

❁❁❁

۱۔ اسلام اور مستشرقین، ملخصاً: ۳/ ۱۴ تا ۲۷: مطبع سابق۔

حاملین استشراق کی قسمیں

مستشرقین کو مندرجہ ذیل قسموں کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے:

- خالص علم کے شیدائی مستشرقین۔
- متعصب مستشرقین۔
- علم کو پیشہ بنانے والے مستشرقین۔
- ملحد مستشرقین۔
- منصف مستشرقین۔
- وہ مستشرقین، جو دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔

- خالص علم کے شیدائی مستشرقین

یوروپ صدیوں جہالت کی تاریکی میں سر سے پاؤں تک ڈوبا رہا، اس وقت جب کہ اسلام کے زیر نگیں ممالک و بلاد میں مسلم علما و دانشوران علم کے موتی لٹا رہے تھے، یورپین دانشور ایسی کتابیں لکھنے میں مصروف تھے، جو قصے کہانیوں اور مذہبی دعاؤں پر مشتمل تھیں، جن کی فطرت میں قدرت نے علم دشمنی ودیعت کر رکھی ہو، بھلا انھیں علم دوستی کیسے نصیب ہو سکتی تھی؟ یہی وجہ ہے کہ مغربی حکومتوں اور خاص طور سے کلیساؤں میں ہر ممکن تدبیر کے ذریعے علم کی مخالفت کی گئی، ایسے میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے، جنھوں نے نور علم سے اپنے قلوب و اذہان کو منور کرنے کی ٹھان لی، اور پھر علم و مذہب کے مابین خونی معرکہ شروع ہوا، چونکہ فتح ہمیشہ حق کے علم برداروں کو نصیب ہوتی ہے، اسی لیے علم و مذہب کے اس جنگ میں بھی فتح انھیں کے حصے میں آئی، جن کے اندر علم دوستی کا جذبہ موجود تھا، انھوں نے مشرقی ممالک کا سفر کیا اور وہاں مسلم علما کی بارگاہوں سے اکتساب فیض کے بعد یورپ کو علمی اقدار

سے آشنا کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

مستشرقین کا یہ طبقہ ہمیشہ موجود رہا ہے اور آج بھی موجود ہے اور یہ طبقہ اس وقت تک موجود رہے گا، جب تک ممالک شرقیہ اسلامیہ میں ایک بھی ایسی چیز موجود ہے، جس سے اہل مغرب استفادہ کر سکتے ہیں اور جس کو بنیاد بنا کر انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کو ترقی دی جا سکتی ہے۔(۱)

مستشرقین کے اس طبقے نے بعض بڑے قیمتی کام کیے ہیں، جن سے اہل مغرب کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی استفادہ کر سکتے ہیں، مثلاً لغات کی کتابیں لکھنا اور انسائیکلوپیڈیاز وغیرہ کی تالیف، گو ان کتابوں میں بھی ایسا مواد وافر مقدار میں موجود ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان مصنفین کے دل بھی اسلام کے خلاف تعصب سے خالی نہیں، لیکن ایک غیر مسلم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ جب اسلام کے متعلق لکھے گا، تو ان عقائد و نظریات سے آزاد ہو کر لکھے گا، جو غیر اسلامی ماحول سے ورثے میں ملے ہیں۔(۲)

مستشرقین کا یہ طبقہ اسلام کے علاوہ دیگر مشرقی تہذیبوں اور مذاہب کے بارے میں بھی ریسرچ کرتا ہے۔(۳)

یہ طبقہ مختلف طریقوں سے مشرق کے چپے چپے کی خاک چھاننے میں مصروف ہے، یہ لوگ کھدائیوں کے ذریعے عالم مشرق کے مختلف علاقوں میں آثار قدیمہ تلاش کرنے میں مصروف ہیں، بے پناہ علمی سرمایہ، جس کو مسلمانوں نے اپنی نااہلی کی وجہ سے طاق نسیان کی زینت بنا دیا تھا، یہ لوگ اس علمی سرمایے کی حفاظت، اس کی ترتیب و تدوین اور اس کی اشاعت کا بندوبست کر رہے ہیں، مسلمانوں نے جو کتابیں لکھیں تھیں، مستشرقین کا یہ طبقہ ان کتابوں سے استفادہ کو آسان بنانے کے لیے ان کی فہرستیں مرتب کر رہا ہے، ان پر حاشیے لگا رہا ہے۔(۴)

۱۔ ضیاء النبی، ملخصاً: ۶/ ۱۸۵؛ مطبع سابق۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۹۰؛ مطبع سابق۔

۳۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۹۱؛ مطبع سابق۔

۴۔ ضیاء النبی: ۶/ ۸۵؛ مطبع سابق۔

لاکھوں کی تعداد میں مخطوطے جو دورِ زوال کے مسلمانوں کی نگاہوں میں ردی کاغذ سے زیادہ کچھ نہ تھے، مستشرقین نے انھیں جمع کر کے یورپ کے لیے علم کا بے پناہ ذخیرہ اکٹھا کیا ہے۔(۱)

اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے چند مستشرقین یہ ہیں:

☆ پروفیسر ٹی ڈبلیو ارنالڈ، جنھوں نے ایک قیمتی کتاب بنام The Preaching of Islam (الدعوۃ الی الاسلام) لکھی، جو علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔

☆ اسٹائل لین پول، جنھوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے کارناموں اور حیات وخدمات پر مشتمل ایک جامع کتاب بنام 'صلاح الدین ایوبی' لکھی۔

☆ ڈاکٹر اسپرینگر، جن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے علامہ ابن حجر کی معروف کتاب 'الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ' پر انگریزی میں ایک وقیع مقدمہ لکھا، جو بہت ساری قیمتی معلومات کا حسین گلدستہ ہے۔

☆ پروفیسر ونسنک، جنھوں نے احادیث کی کتابوں کے ساتھ ساتھ سیر ومغازی کی مشہور کتابوں سے احادیث نبویہ کو اکٹھا کر کے ان کی ایک فہرست تیار کی، جس کا نام 'المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث' رکھا، مشہور مصری عالم استاذ فواد عبد الباقی نے اس کتاب کو عربی زبان میں منتقل کیا ہے اور اس کا نام 'مفتاح کنوز السنۃ' رکھا ہے۔

☆ کارل برکلمان، جس نے 'تاریخ الادب العربی' نامی کتاب لکھی، جس کتاب کے تعلق سے ابوالحسن علی ندوی کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے:

"والکتاب لایستغنی عنہ باحث فی تاریخ الادب العربی فی الفقہ والشعر والنثر والعلم والفلسفۃ والتاریخ وغیرھا۔"(۲)

اس قسم کے دیگر مستشرقین کا تفصیلی ذکر مستشرقین کے علمی کارنامے کی سرخی کے تحت آرہا ہے۔

۱۔ضیاء النبی:۶/۸۶؛ مطبع سابق۔

۲۔ملخصا الاستشراق والمستشرقون،ص:۱۷؛ مطبع سابق۔

✪ متعصب مستشرقین

تحریک استشراق کا پس منظر اور اس کے ظہور کے اسباب و محرکات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بنیاد ہی تعصب اور اسلام دشمنی پر رکھی گئی ہے، چنانچہ اس تحریک کی ابتدا چاہے پطرس محترم سے ہوئی ہو، یا یوحنا دمشقی سے، جان آف دمشق سے ہوئی ہو، یا جریری دی اوراِل یاک سے ہوئی ہو، اور اس تحریک کا داعی چاہے صلیبی جنگوں میں اہل صلیب کی شکست ہو، چاہے بلاد شرقیہ پر استعماری تسلط کا خوف بہر حال ہر ایک کے اندر اسلام دشمنی اور اسلام و پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عداوت و نفرت کا جذبہ موجود تھا، اور اگر اس تحریک کے فکری بانیوں یعنی عہد رسالت کے یہود ونصاریٰ کو دیکھا جائے تو ان کی زندگی کا ہر عمل، ان کی حیات کی ہر حرکت اور ان کی عقل کی ہر سوچ و فکر اسلام دشمنی ہی کے زیر اثر نظر آئے گی۔

اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ اسلام کا مطالعہ نہ تو حقائق تک پہنچنے کے لیے کرتے ہیں اور نہ ہی وہ اسلام کی حقیقت کو سمجھنے کے اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ان کے ذہن مذہبی تعصب کے آگ میں جل رہے ہیں اور مذہبی تعصب اتنی ظالم شئی ہے کہ یہ انسان کو حق کی طرف دیکھنے کی طرف اجازت نہیں دیتا ہے، اگرچہ حق روز روشن کی طرح عیاں ہو۔(۱)

اس طبقے کے مستشرقین نے بے لاگ علمی تحقیق کے لبادے میں اسلام کے متعلق جو تحقیق کی ہے، اس کے چند نمونے علامہ پیر کرم شاہ ازہری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ضیاء النبی میں محمد محمد الدہان کی کتاب "قوی الشر المتحالفة وموقفها من الاسلام والمسلمین" سے نقل کی ہیں، میں یہاں ان کو نقل کر رہا ہوں۔

ایک فرانسیسی مستشرق کیمون اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''دین محمدی جذام کا مرض ہے جو لوگوں میں پھیل رہا ہے، اس مرض نے لوگوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے بلکہ یہ ایک خوفناک مرض ایک عام فتنہ اور ایک ایسا جنون ہے جو سب کچھ فراموش کرا دیتا ہے، جو انسان کو سستی اور کاہلی پر ابھارتا ہے، جو آدمی اس مرض میں مبتلا

۱۔ الاسلام والمستشرقون، ص: ۱۳۶، ۱۳۷، مطبع سابق۔

ہوا سے قتل وغارت، شراب نوشی اور بدکاری کی دعوت کے سوا کوئی چیز سستی اور کاہلی کی اس حالت سے نہیں نکال سکتی ہے۔"(۱)

جس دین حق نے دنیا کو شرک وبت پرستی قتل وخون ریزی اور معاشرہ کی تمام برائیوں سے نجات عطا کی ہو، اس کو خوفناک مرض اور فتنے سے تعبیر کرنا تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟ جس دین میں ایک انسان کے قتل کو تمام انسانوں کا قتل قرار دیا گیا ہو، شراب نوشی پر اسی کوڑے اور بدکاری پر سو کوڑے یا سنگسار کرنے کا قانون لاگو کیا گیا ہو، اسی کو قتل وغارت، شراب نوشی اور بدکاری کا داعی بتلانا مستشرق موصوف کے دل میں چھپے اسلام کے خلاف تعصب کی کھلی دلیل کے سوا اور کیا ہے؟ یہی مستشرق ایک جگہ اور لکھتا ہے:

"محمد کے قبر کی مثال بجلی کے کھمبے جیسی ہے، جو مسلمانوں کے سروں میں جنون پیدا کرتا ہے اور وہ ایسی چیزوں کے عادی بن جاتے ہیں، جو سادہ طبیعتوں کا خاصا ہیں مثلاً خنزیر کا گوشت کھانا، شراب نوشی اور موسیقی سے نفرت اور جو چیزیں سفاکی اور بدکاری کے خیالات سے جنم لیتی ہیں، ان سے محبت۔"(۲)

مزید لکھتا ہے:

"میرا اعتقاد ہے کہ مسلمانوں کی ساری آبادی کے پانچویں حصے کو نیست ونابود کر دیا جائے اور جو باقی بچ جائیں انھیں مشقت طلب کاموں میں لگا دیا جائے، کعبہ کو گرا دیا جائے اور محمد ﷺ کی قبر اور ان کے جسم کو لوفر کے عجائب گھر میں رکھا جائے۔"(۳)

کیمون نامی مستشرق کے مذکورہ بالا گھناؤنے نظریات تقریباً اس طبقہ سے متعلق تمام مستشرقین کے دل کی آواز ہیں، یہ نظریات کیمون کے ذاتی خیالات نہیں ہیں، بلکہ اسے وراثۃً ملے ہیں، اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف مذکورہ بالا زہر افشانیاں کوئی نئی چیز نہیں ہیں، تاریخ پر نظر رکھنے والے بخوبی آگاہ ہیں کہ اسلام نے یہود ونصاریٰ کو عسکری میدان میں پے در پے شکستیں دی تھیں، عیسائیت اور یہودیت کو بت پرستوں کے مقابلہ میں اہل کتاب

۱۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۹۲؛ مطبع سابق۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۹۲؛ مطبع سابق۔

۳۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۹۳؛ مطبع سابق۔

ہونے کی وجہ سے یہود ونصاریٰ کو جو سماجی برتری حاصل تھی، بت پرستوں کے مسلمان ہوجانے سے وہ بھی ختم ہوگئی تھیں، اہل کتاب کے علما اور راہبوں کو جو سماجی اہمیت حاصل تھی اور اس سماجی حیثیت کے سہارے وہ جس اقتصادی خوش حالی سے لطف اندوز ہورہے تھے، اسلام نے اس کا خاتمہ کردیا تھا، علاوہ ازیں مستشرقین کے دل کو سب سے زیادہ ٹھیس اس بات سے پہنچی کہ ان کے توقع کے برخلاف پیغمبر آخرالزماں کی بعثت بنواسحاق کی بجائے بنو اسماعیل میں ہوئی، جس سے بنواسحاق کے معتقدین یہود ونصاریٰ کے دل میں حسد اور بغض وعناد کا پیدا ہوجانا فطری امر تھا، یہی وہ اسباب وعلل تھے جنھوں نے مستشرقین کو اسلام کے خلاف متعصّبانہ رویہ اختیار کرنے پر ابھارا، اور انھوں نے اپنی غیرت وحمیت کو بالائے طاق رکھ کر اسلام کے خلاف ایسی ایسی خلاف واقعہ باتیں گھڑیں کہ اللہ کی پناہ، تعجب ہوتا ہے کہ مستشرقین جو اسلام پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں، وہ خود اسلام کو نیست ونابود کرنے اور کعبہ کو ڈھانے کی رائے دے رہے ہیں، کیا کسی مذہب کے پیروکاروں کو نیست ونابود کرنا، اس کے مرکز عقیدت پر تیشہ باری کرنا اور اس کے قائد کی قبر کھودنا تشدد پسندی نہیں ہے؟ اگر نہیں تو مستشرقین تشدد پسندی کی کوئی ایسی تعریف پیش کریں جس کے دائرے سے یہ ساری چیزیں خارج ہوں۔

اس طبقے کے مستشرقین نے ایک طرف اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو برانگیختہ کرکے اور ان کے آئینۂ دل کو ٹھیس پہنچا کر اپنے تعصب کا مظاہرہ کیا تو دوسری طرف انھوں نے کچھ اچھے کام بھی کیے، جس کا مقصد مسلمانوں کو اپنے دین سے دور اور عیسائیت سے قریب کرنا تھا، چنانچہ انھوں نے اسکول اور کالج قائم کیے، اسپتال کھولے، اور ان میں مریضوں کا مفت علاج کرنے کا ڈھونگ رچایا، خیراتی ادارے اور تنظیمیں قائم کیں اور اپنے آپ کو دکھی انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد ظاہر کرکے دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ صرف ان کا دین ہی اپنے دامن میں دکھی، انسانیت کے لیے نجات اور فلاح کی خوش خبری لے کر جلوہ گر ہوا ہے۔(۱)

اب آیئے مشہور اسلامی اسکالر مصطفی صادق الرافعی کی کتاب 'الاستشراق

۱۔ضیاء النبی: ۶/ ۱۹۵: مطبع سابق۔

والمستشرقون‘ سے چند متعصب مستشرقین کا تعارف ملاحظہ فرمائیں:

K.Crogg:

یہ امریکی مستشرق ہے، اسلام کے خلاف شدید متعصب تھا، قاہرہ میں واقع جامعہ امریکیہ میں تدریس کا کام انجام دیا، امریکی تبشیری رسالہ ’العالم الاسلامی‘ کا ایڈیٹر بھی رہا ہے، اوراس کی کتابوں میں ’دعوۃ المئذنۃ‘ مشہور کتاب ہے، جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔

A.J.Arberry:

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب میں مشہور انگریزی مستشرق ہے ’دائرۃ المعارف الاسلامیۃ‘ کے قلم کاروں میں سے ہے، کیمبرج یونیورسٹی کا استاذ بھی رہ چکا ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ بہت سارے مصری علما کا استاذ بھی ہے جو انگلینڈ سے پڑھ کر فارغ ہوئے، اس کی کتاب میں ’الاسلام الیوم‘ اور ’مقدمۃ لتاریخ التصوف‘ کافی اہم کتابیں مانی جاتی ہیں، اس کی علمی کاوشوں میں سے ترجمہ قرآن بھی ہے، جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔

A.Geom:

مشہور انگریزی مستشرق ہے، انگلینڈ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی، اس کی تحریروں اور خیالات پر تبشیری روح غالب تھی، قابل تعجب امر یہ ہے کہ بہت سارے مصری اسکالر اس کے شاگرد ہیں، جنھیں مصری حکومت نے بیرون ملک مشرقی زبانوں کے مطالعہ کی غرض سے بھیجا تھا۔

Goldziher:

اپنی اسلام دشمنی میں مشہور ومعروف ہے ’دائرۃ المعارف الاسلامیۃ‘ کے محررین میں سے ہے، قرآن وحدیث دونوں سے متعلق اس کی کئی کتابیں ہیں، اس کی مشہور کتاب ’تاریخ مذاہب التفسیر الاسلامی‘ ہے۔(۱)

✿۔ علم کو پیشہ بنانے والے مستشرقین

تحریک استشراق کی ابتدائی تاریخ سے باخبر حضرات بخوبی جانتے ہوں گے کہ

۱۔ الاستشراق والمستشرقون للدکتور مصطفی صادق الرافعی: ص/ ۳۲، ۳۳، ۳۷: مطبوعہ دار البنان، بیروت۔

اس تحریک کے فکری آغاز کا داعیہ یہود و نصاریٰ کا وہ خوف تھا جو اسلام کی آمد پر ان کے جاہ وجلال اور دولت واقتدار کے چھن جانے کو لے کر ان کے دل میں پیدا ہوا تھا، اسلام دشمنی اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف عہد نبوی ﷺ کے یہود و نصاریٰ کی ریشہ دوانی کے اسباب میں سے اس سبب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، اہل کتاب ہونے کے ناتے عرب کے امی معاشرہ میں جو عزت ووقار ان کو حاصل تھی، اس کی بدولت ان کی جائداد اور پراپرٹی بھی خوب بنی ہوئی تھی، نذر و نیاز اور تحفے تحائف بھی خوب ملتے تھے، مکہ سے قریب اور یثرب جیسی مرکزی جگہ میں آباد ہونے کے ناتے باہر سے تاجروں کے قافلے جب ان سے ہو کر گزرتے، تو ان کی بارگاہوں میں کافی گرانقدر ہدایا پیش کرتے، ظاہر ہے اسلام کی آمد نے یہود و نصاریٰ کی آمدنی کے ان سارے راستوں کو بند کر دیا تھا، اب نہ انہیں وہ عزت ووقار حاصل تھا، نہ ہی ان کی دولت وثروت میں اضافے کا کوئی امکان رہ گیا تھا، ایسے میں ان کے دل میں اسلام کے خلاف جو نفرت اور تعصب پیدا ہوا سو ہوا ہی، ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے یہود ونصاریٰ بھی سامنے آئے جن کے اندر اپنے دین کی حمایت کا جذبہ کم، اور اپنے کھوئے اقتدار اور دولت وثروت کی حصولیابی کا جذبہ زیادہ تھا، اس کے لئے انہوں نے اپنے علم ودانش کو ہتھیار بنایا، چنانچہ عہد رسالت ہی میں کچھ ایسے یہود و نصاریٰ ملیں گے جو اس دور کے امراء اور اہل ثروت کی رضاجوئی کے لئے علمی خیانت کی بھی جرأت کر لیتے تھے، اور ان کے لئے غلط فتوے دے کر ان سے نذر و نیاز وصولتے تھے، یہی چیز نسلاً بعد نسل منتقل ہو کر مستشرقین تک پہونچی، اپنے اسلاف کی طرح یہ بھی دو حصوں میں بٹے چنانچہ مستشرقین کی صفوں میں جہاں متعصب عیسائی اور یہودی لوگ شامل ہیں، جو اپنے اپنے ادیان کو دیگر ادیان پر فائق ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں، وہیں اس تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا دین پارۂ نان کے سوا کچھ نہیں، مستشرقین کے اس طبقہ کے معرض وجود میں آنے کی ایک وجہ اور ہے جسے علامہ پیر کرم شاہ ازہری کے الفاظ میں سنئے، فرماتے ہیں:

”چونکہ استشراق کی تحریک نے ہمیشہ تبشیر یا استعمار کی طرف سے ملنے والی مالی امداد اور سماجی حیثیت پر بھروسہ کیا ہے، اور اس تحریک کے اندر بھی اکثریت ان ہی لوگوں کی ہے، جن کے عزائم مذہبی یا سیاسی ہیں، اس لئے اس تحریک کے پلیٹ فارم کو استعمال کر کے

وہی لوگ ترقی کر سکتے ہیں جو اپنی تحقیقات کو اسی رنگ میں پیش کریں جو تبشیری اور استعماری طاقتوں کے مرضی کے مطابق ہو۔"

مزید لکھتے ہیں:

"مستشرقین کو یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں، مجلوں، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بڑے بڑے عہدوں کی شکل میں اپنی کوششوں کا انعام ملتا ہے، اس قسم کے گراں بہا انعامات کا مستحق صرف ان مستشرقین کو قرار دیا جاتا ہے، جو وہی کچھ لکھ کر پیش کریں جو ان کی مرضی اور پالیسی کے مطابق ہو جو انعام دے سکتے ہیں، ان حالات میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا جو اپنے علم کو مستعمرین اور مبشرین کے خوفناک عزائم کے لئے استعمال کر کے اونچے اونچے عہدوں اور مالی مفادات حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گیا، ان لوگوں نے پادریوں اور پوپوں کو راضی کرنے کے لئے اسلام کے خلاف زہر اگلا، جو علم و تحقیق کے نام پر بدنما دھبے کی حیثیت رکھتا ہے، مستشرقین کے اس طبقے نے استعماری طاقتوں کے استبدادی عزائم کی تکمیل کے لئے اپنی علمی صلاحیتیں صرف کیں۔"(۱)

یہ طبقہ اتنی ہی طویل تاریخ رکھتا ہے جتنی طویل استشراق کی تاریخ ہے، کبھی یہ طبقہ پاپائے روم کا اشیرواد حاصل کرنے کے لئے مصروف جدوجہد رہا، کبھی اپنی علم فروشی کے کارناموں پر انہوں نے مغربی حکمرانوں کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا ہے، اور کبھی تجارتی کمپنیوں کے ڈائریکٹروں سے حق خدمت وصول کرنے کے لئے انہوں نے بل پیش کیا۔

اس طبقے کا کوئی دین نہیں، یہ لوگ صرف چند لقموں کی خاطر علم بیچتے ہیں، اسی قسم کے لوگوں کے تحریک استشراق میں موجود ہونے پر "سٹیفن وائلڈ" نے ندامت کا اظہار کیا ہے۔"(۲)

۔ملحد مستشرقین

جب آفتاب اسلام اپنے علمی تعاون سے چہار دانگ عالم کو منور و مجلی کر رہا تھا، اس

۱۔ضیاء النبی: ۶/ ۱۹۸، ۱۹۹: مطبع سابق۔

۲۔ضیاء النبی: ۶/ ۲۰۰: مطبع سابق۔

وقت یورپ سر سے پاؤں تک جہالت کے ولدل میں ڈوبا ہوا تھا، جس وقت اسلامی اسکالرس کی نوک قلم سے علمی وادبی شہ پارے نکل رہے تھے، اس وقت یہودی وعیسائی رہنماؤں کا قلم دیومالائی قصوں، کہانیوں اور جھوٹے افسانوں کی ترویج واشاعت کررہا تھا، ایسے تاریک ماحول میں یورپ کے اندر کچھ علمی چراغ روشن ہوئے، یہ اس وقت ہوا جب اہل یورپ نے دیکھا کہ اسلام کی ترقی کا راز علم اور مذہب کے حوالے سے مسلمانوں کی بے پناہ جدوجہد ہے، ترقی کسے نہیں محبوب ہوتی ہے، ایسے میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوئے، جنہوں نے علم کے حصول کے لئے بے پناہ جدوجہد کی، لیکن ان کا یہ فیصلہ ان کے لئے بڑا خطرناک ثابت ہوا، چنانچہ علم کے ان متوالوں اور کلیسا کے مسند نشینوں کے بیچ ایک خونریز معرکہ برپا ہوا، ایک طرف کلیسا اور پاپائے روم کی بے پناہ طاقت تھی، تو دوسری طرف علم کے ان پیاسوں کا بے پناہ جذبہ، کلیسا اور پاپائے روم ہر اس شخص کو قابل گردن زدنی سمجھتے تھے جس کے اندر حصول علم کا ذرہ بھر بھی شوق پایا جاتا تھا، یا جو اسلام کی علم دوستی کی کچھ بھی تعریف کرتا، ایسے لوگوں کو کلیسا کے نزدیک کافر گردانا جاتا تھا، یورپ کی علم دشمنی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ حکومت روم نے علم دوستوں کو سزا دینے کے لئے ۱۴۷۸ء میں ایک مذہبی عدالت قائم کی، اس نے پہلے دو ہزار اشخاص کو زندہ جلایا، اور ستر ہزار کو قید وبند کی سزا دی، دس برس میں اس عدالت نے سترہ ہزار کو آگ میں پھینکا، ستانوے ہزار تین سو اکیس افراد کو قید وبند کی سزا دی، اور ساتھ ہی مختلف علوم کی چھ ہزار کتابیں جلادیں، یورپ کی مرکزی مذہبی عدالت نے ۱۴۸۱ھ اور ۱۸۰۸ء کے درمیانی عرصے میں تیس لاکھ چالیس ہزار نفوس کو نہایت المناک سزائیں دیں، ان میں سے ۳۲ ہزار کو زندہ جلایا۔"(۱)

ظاہر ہے یہ صورتحال علم دوستوں کے لئے نہایت تکلیف دہ تھی، وہ بھی مجبور ہوکر مذہب کے (علم دشمن) ٹھیکیداروں کے سامنے سینہ سپر ہوگئے، اس صورتحال میں یورپ میں الحاد کی تحریک نے زور پکڑا، اہل یورپ کی قومی زندگی کا ہر شعبہ ان لوگوں کے قبضہ میں چلا گیا جو عیسائی کہلاتے تھے، لیکن ان کی سوچ بھی ملحدانہ تھی، اور ان عمل بھی ملحدانہ تھا، زندگی کے تمام شعبوں کی طرح استشراق کی تحریک میں بھی ملحد شامل ہوگئے، یہ ملحد مستشرقین استشراقی

۱۔ یورپ پر اسلام کا احسان، ص: ۶۰ بحوالہ ضیاء النبی: ۶/۱۹۶، مطبع سابق۔

جدوجہد میں عیسائی راہبوں اور پادریوں کے شانہ بشانہ مصروف کار تھے، ان لوگوں کو عیسائیت یا یہودیت سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔"(۱)

ملحد مستشرقین ہی یورپ میں علمی انقلاب لانے والی فواج کا ہراول دستہ ہیں، اس کے لئے ان کو بے شمار قربانیاں دینی پڑیں، پھر جب یورپ میں علم وحکمت کی باد بہاری چلی، اس وقت ان مستشرقین کی قدر لوگوں کی سمجھ میں آئی، پھر تو ان پر طرح طرح کی نوازشات کی برسات ہونے لگی، اگر یہ مستشرقین دائرہ الحاد میں رہ کر اپنی علمی خدمات انجام دیتے تو بھی ان سے غیر جانبداری کی توقع تھی لیکن آگے چل کر یہی مستشرقین استعمار پسند طاقتوں کا شکار ہوکر دین یہودیت وعیسائیت کے طرف دار اور دین اسلام کے زبردست مخالف بن گئے، جس کے نتیجے میں ان کا قلم بھی جانبدار ہوگیا۔

✿-انصاف پسند مستشرقین

انسان کی فطرت میں قدرت نے انصاف پسندی رکھی ہے، کسی عارضی مجبوری یا لالچ کی بنا پر یہی انصاف پسندی ناانصافی میں تبدیل ہوجاتی ہے، چنانچہ مستشرقین کی صف میں جس طرح غیر منصف مستشرقین کی بہتات ملے گی، اسی طرح سے کچھ ایسے مستشرقین بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے مبدأ فیاض کی طرف سے ودیعت کردہ فطری انصاف پسندی ہی کے زیر اثر رہ کر کام کیا ہے، پاپائی اقتدار اور کلیسا کے ظلم وجبر کے سامنے انصاف پسندی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی، پھر بھی سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یورپ میں ایسے لوگ منظر عام پر آئے جنہوں نے کلیسا کی اندھی تقلید کا پٹہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکا، اور صدیوں سے مشہور روایات کو عقل کے پیمانوں پر پرکھنے کی طرح ڈالی، انہوں نے عیسائیت کے عقائد کو تنقید کی نظر سے دیکھا، پاپائے روم اور پادریوں کے اختیارات کو چیلنج کیا اور آخر کار یہی تحریک پاپائی اقتدار کے خاتمے اور یورپ کی نشأۃ ثانیہ پر منتج ہوئی۔(۲)

انصاف پسندی کی اس تحریک نے بہت سارے مستشرقین کو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے نئے سرے سے مطالعہ کرنے کی دعوت دی، جس کے نتیجے میں بہت

۱۔ضیاء النبی:۶/ ۱۹۷؛ مطبع سابق۔
۲۔ضیاء النبی:۶/ ۲۰۰، ۲۰۱؛ مطبع سابق۔

سارے مستشرقین نے اسلام اور داعیٔ اسلام ﷺ کی عظمت شان کا اعتراف کیا، ساتھ ہی ساتھ اس تحریک نے بہت سارے مستشرقین کو تحریک استشراق کے ان سرخیلوں پر تنقید کی جرأت بھی عطا کی جنہوں نے مذہبی تعصب کے ناتے اسلام اور نبی کریم ﷺ کے خلاف الزام تراشیاں کی تھیں، ذیل میں ہم چند منصف مستشرقین کا تذکرہ کرتے ہیں۔

رچرڈ سائمن، پیٹر، بائیل، سائمن، اوکلے، ہادریان ریلانڈ، مائیکل ایچ ہارٹ، ڈاکٹر مورس بکائلے، تھامس کارلائل، لامارتین، پروفیسر لیک، برنارڈ شاوغیرہ۔(۱)

وہ مستشرقین جو دولت ایمان سے سرفراز ہوئے

بے لاگ علمی تحقیق کبھی کبھی انسان کی ہدایت کا سبب بن جاتی ہے، چنانچہ بہت سارے مستشرق محققین نے جب اپنی آنکھوں سے تعصب و تنگ نظری کا پردہ ہٹا کر اور ایک دم غیر جانبدار ہو کر اسلام کا مطالعہ کیا تو پھر ان کے ذہن و دماغ پر اسلام کی حقانیت چھاتی چلی گئی اور ایک دن نہایت ہی فخر و انبساط کے ساتھ انہوں نے اسلام قبول کر لیا، علامہ پیر کرم شاہ ازہری فرماتے ہیں:

''حقیقت کو لاکھ چھپایا جائے وہ ایک نہ ایک دن عیاں ہو ہی جاتی ہے، اسلام ایک اٹل حقیقت ہے، مستشرقین اور یہود و نصاریٰ نے اس کے رخ زیبا پہ لاکھ پردہ ڈالنے کی کوشش کی، مگر انہیں مستشرقین میں چند پاکباز شخصیتوں نے آگے بڑھ کر اسلام کے صحیح رخ کا مطالعہ کیا، اس کے محاسن و مکارم کی خیرہ کن شعاعوں نے ان کے تاریک قلوب کو بقعۂ نور میں تبدیل کر دیا، اور پھر ان کی پیاسی روحیں اسلام کی طرف کھنچتی چلی گئیں، اور وہ دن بھی آیا جب فخر و انبساط کے ساتھ انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا، بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہوں نے یورپ میں آنکھیں کھولیں، مستشرقین سے تعلیم حاصل کی، لیکن آخر کار توفیق خداوندی نے انہیں ملت اسلامیہ کا جزو لاینفک بنا دیا۔''(۲)

مزید فرماتے ہیں:

''کئی مستشرقین کو قدرت نے ہدایت کی دولت عطا فرمائی اور آج وہ تحریک

۱۔ضیاء النبی: ۶/ ۲۰۳: مطبع سابق۔

۲۔ضیاء النبی: ۶/ ۲۱۲: مطبع سابق۔

استشراق کے پودے کی آبیاری کے لئے نہیں، بلکہ اسلام کی خاطر اپنی صلاحیتوں کو صرف کررہے ہیں اور ان لوگوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ خلوص اور جذبے کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کی کوششوں میں مصروف ہیں جن کو دولت اسلام ورثے میں ملی ہے۔"(۱)

ذیل میں ہم چند فرخندہ فال شخصیتوں کا ذکر کررہے ہیں، جن کی علمی تحقیق نے ان کو ساحل ہدایت سے ہمکنار کیا۔

عبداللہ بن عبداللہ، ڈبلیو ایچ کیولیم، رسل ویب، مارٹن لنگر، ڈاکٹر ارتھر کین، جان سنت، علاء الدین شلبی، علامہ محمد اسد پولینڈ وغیرہ۔(۲)

۱۔ضیاء النبی:۶/ ۲۰۰، ۲۰۱؛مطبع سابق۔

۲۔ضیاء النبی:۶/ ۲۱۳؛مطبع سابق۔

تحریک استشراق کے اہداف ومقاصد

مستشرقین کی علمی سرگرمیاں جن اہداف ومقاصد کے اردگرد گردش کرتی ہیں، وہ بنیادی طور سے مندرجہ ذیل ہیں:

دینی مقاصد، علمی مقاصد، اقتصادی مقاصد، سیاسی مقاصد۔

✿- دینی مقاصد

ان تمام مقاصد میں دینی مقاصد کو کئی جہتوں سے اولیت حاصل ہے، اس لئے ہم تفصیل سے اس کو پہلے ذکر کررہے ہیں۔

ظہورِ اسلام سے لے کر اب تک ہلال وصلیب کے بیچ ہمیشہ معرکہ آرائی ہوتی رہی ہے، جس کے اساسی اسباب دینی تھے، سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں اہل صلیب کے زبردست شکست کھانے کے بعد باضابطہ عملی طور پر استشراق کی تحریک کا آغاز ہوا، چونکہ صلیبی جنگوں کے دواعی بھی دینی اور مذہبی تھے، اس لئے اس کی کوکھ سے جنم لینے والی اس تحریک کے بنیادی اسباب بھی دینی ہی ہیں، اور جس تحریک کو معرض وجود میں لانے والے اسباب دینی ہوں اس کے مقاصد بھی دینی ہی ہوں گے، اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ تحریک استشراق جن مقاصد کے تحت منصۂ شہود پر آئی وہ مقاصد بھی دینی ہیں، حاملین استشراق کے سامنے جو دینی مقاصد تھے ان کو تین حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے:

(۱) دین اسلام کو دنیا کی اقوام عموماً، اور یہودی اور عیسائی اقوام میں خصوصاً پھیلنے سے روکا جائے۔

(۲) مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے تگ ودو کی جائے۔

(۳) صدیوں سے مروج بائبل کی تعلیمات کا اصل عبرانی زبان کی تورات سے

موازنہ کر کے اس کی غلطیوں کی اصلاح کی جائے۔(۱)

اول الذکر مقصد کی حصولیابی کے لئے مستشرقین نے جو پروگرام وضع کیا اس کی چند اہم شقیں یہ ہیں:

☆ ایسے آدمی تیار کئے جائیں جو مسلمانوں کی زبان، ان کی تہذیب، عقائد اور دیگر مظاہر حیات سے پوری طرح آگاہ ہوں، اور ان تربیت یافتہ لوگوں کو اسلامی ممالک میں تبلیغی مشنوں پر بھیجا جائے، جہاں وہ مختلف فلاحی کاموں کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں میں عیسائیت کی بیج بوئیں۔

☆ تبلیغی کاموں کی خاطر سرمائے کی فراہمی کے لئے حکومتوں کے علاوہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں سے رابطہ کیا جائے۔

☆ اپنے کام کو منظم رکھنے اور تحریک میں اسپرٹ پیدا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً کانفرنسیں منعقد کرنا، اور تبشیری کاموں کی نگرانی کے لئے انجمنیں بنانا۔

☆ ایسے مصنفین اور مؤلفین تیار کئے جائیں، جو اسلام کی بنیادی کتابوں کا مطالعہ کریں، اور پھر اسلام اور پیغمبر اسلام کے تعلق سے ایسے عقائد گھڑیں جن سے مسلمانوں کے دلوں میں خود اپنے مذہب کے خلاف بیزاری پیدا ہو۔

☆ اسلام کو ایک جھوٹا دین ثابت کیا جائے اور یہودیت وعیسائیت کو آسمانی مذہب ثابت کیا جائے، تاکہ یہود ونصاریٰ اپنے ہی مذہب کو سچا سمجھ کر اسی پر کاربند رہیں، اسلام کی طرف ان کا خیال تک نہ جانے پائے۔

مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے مستشرقین نے درج ذیل کوششیں کی ہیں۔

عیسائی مبلغین نے انسانی ہمدردی، اخوت، رحمدلی، مساوات اور آزادی کا خوبصورت لباس زیب تن کیا، انہوں نے اسکول کھولے، تاکہ عیسائیت کا بیج ان نونہال بچوں کے دلوں میں بو سکیں جن کو آسانی سے اپنی طرف مائل کیا جاسکتا ہے، ان کی توجہ اعلیٰ تعلیم پر نہ تھی بلکہ ان کی توجہ کا مرکز پرائمری تعلیم تھی، کیوں کہ اسی سطح پر وہ بچے کی طرف سے کسی

۱۔ضیاء النبی:۶/ ۲۳۷، ۲۳۸؛ مطبع سابق۔

مزاحمت کے بغیر اس کے دل سے ایمان کی دولت نکال سکتے تھے۔(۱) ہسپتال قائم کئے گئے، ڈسپنسریوں اور میڈیکل ہالوں کا قیام عمل میں آیا، چنانچہ صرف ایک تبشیری تنظیم 'کلینو موبیل' پر ۱۸۰/ ہسپتالوں، ۱۲۹ ڈسپنسریوں، ۳۴۵ میڈیکل ہالوں اور ۴۵/ گشتی ڈسپنسریوں کو ادویہ فراہم کرنے کی ذمہ داری تھی۔(۲)

انہوں نے غریب لوگوں میں ضروریاتِ زندگی مثلاً کپڑے اور چاول تقسیم کئے، دینی مدارس قائم کئے، چنانچہ اس سلسلے میں مبشر 'نکل' کہتا ہے:

''ہمیں سیکولر بنیادوں پر مدارس کے قیام کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے، کیونکہ مسلمانوں کی کثیر تعداد نے جب اہل مغرب کی درسی کتابیں پڑھیں، اور اجنبی زبانیں سیکھیں تو قرآن اور اسلام پر ان کا اعتقاد متزلزل ہو گیا۔''(۳)

انہوں نے مسلمانوں کا تعلق مدنی تہذیب سے منقطع کر کے ان کو مغربی تہذیب کا دلدادہ بنانے کی بھرپور جدوجہد کی، چنانچہ اس بارے میں پروفیسر خلیق نظامی لکھتے ہیں:

''مستشرقین کے پیش نظر سب سے زیادہ اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق ان کی حیات اجتماعی کے دینی، تمدنی اور فکری سرچشموں سے منقطع کر دیا جائے، تا کہ جب وہ کسی انسانی کمال یا کارنامے کا تصور کریں، تو ان کا ذہن مغرب کے سوا کسی دوسری طرف منتقل ہی نہ ہو سکے۔(۴)

انہوں نے قرآن کریم کے اندر طرح طرح کے عیوب نکال کر اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی، ان کا یہ اقدام بڑا خطرناک تھا، اس سے ایک طرف قرآن کے کتاب اللہ ہونے کے مستحکم عقیدے میں دراڑ پڑ جانے کا خوف تھا، تو دوسری طرف قرآنی تہذیب وتمدن سے اعراض کر کے یورپین تہذیب وتمدن میں داخل ہونے کا خوف تھا، چنانچہ ڈاکٹر التہامی اپنے مقالہ 'قرآن اور مستشرقین' میں لکھتے ہیں:

۱۔ ضیاء النبی: ۶/ ۲۵۹؛ مطبع سابق۔

۲۔ الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری: ص: ۱۰۱؛ مطبع سابق۔

۳۔ قوی الشر المتحالفۃ: ص: ۱۰۰؛ مطبوعہ دار الوفا للطباعۃ والنشر، المنصورہ: ۱۹۸۸ء۔

۴۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۱۸؛ مطبع سابق۔

’’اگر نصِ قرآنی پر اعتماد اٹھ جائے، قرآن کی روایت کرنے والوں کی دیانت مشکوک ہو جائے، اور یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ قرآن اپنی ابتدائی صورت میں باقی نہیں رہا، تو اس کی ہدایات کی بجا آوری میں جوش، اور تعلیمات قرآنی پر عمل درآمد کا جذبہ ہی رخصت ہو جائے گا۔‘‘(۱)

اسی طرح ولیم جیفورڈ بالگراف لکھتا ہے:

’’جب قرآن اور مکہ کا شہر نظروں سے اوجھل ہو جائیں، تو پھر ممکن ہے کہ عربوں کو ہم اس تہذیب میں آہستہ آہستہ داخل ہوتے دیکھ سکیں، جس تہذیب سے ان محمد ﷺ اور ان کی کتاب کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں روک سکتی ہے۔‘‘(۲)

انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی طور پر تقسیم کرنے کی سازش بھی رچی، تاکہ وہ سیاسی طور پر کمزور ہوں اور ان کے درمیان مغربی تہذیب کو پنپنے کا موقع مل سکے۔

انہوں نے مسلمانوں کو عیسائیت کا اسیر بنانے کے لئے عیسائیت کے اہم عقائد پر کتب و رسائل لکھے، اور ان کو سستے داموں پر فروخت کیا، اسی طرح انہوں نے انجیل کی تعلیمات کو عام کرنے کی غرض سے اسے مختلف زبانوں میں شائع کیا۔

یہود و نصاریٰ کی ان ساری کوششوں کے باوجود اسلام اپنی جگہ قائم و دائم رہا، قرآن اپنی عظمت کے ساتھ ویسے ہی موجود رہا، پیغمبر اسلام ﷺ کی شوکت سروری کے پھریرے لہرائے جاتے رہے، خالق کائنات کے تقدس کے نغمے ویسے ہی گائے جاتے رہے، اور مسلمان دین اسلام پر پہلے ہی کی طرح جمے رہے، آخر کار صموئیل زویمر کو ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کہنا ہی پڑا کہ:

’’ہم نے اسلام کو نقصان پہونچانے کے لئے کثیر وقت اور سرمایہ صرف کیا، بے شمار کتابیں تصنیف کیں، لیکن ہمیں کچھ حاصل نہ ہوا۔‘‘(۳)

مزید کہتا ہے کہ:

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۶/ ۱۳۲؛ مطبع سابق۔

۲۔ قوی الشر المتحالفۃ: ص: ۷۲؛ مطبع سابق۔

۳۔ قوی الشر المتحالفۃ: ص: ۱۳۳ بحوالہ ضیاء النبی: ۶/ ۲۵۶؛ مطبع سابق۔

”عیسائی مبشر کو مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں میں ناکامی پر مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہیے، تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی عقیدے کو متزلزل کردو۔“(۱)

✿۔علمی مقاصد

مستشرقین نے جن اہم مقاصد کی حصولیابی کی خاطر جدوجہد کی، ان میں بنیادی مقاصد تین ہیں، ایک تو دینی مقاصد، دوسرے استعماری اور تیسرے علمی مقاصد، تاریخ استشراق کے قارئین اس بات سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ مستشرقین کو جتنی کامیابی آخرالذکر مقاصد میں ملی اور کسی مقصد میں نہیں ملی، چنانچہ مستشرقین اپنی انتھک کوششوں سے مسلمانوں کو اپنی تہذیب کا دلدادہ بنانے میں تو ضرور کامیاب ہوئے، لیکن ان کو مکمل طور پر دین مسیحیت یا یہودیت میں داخل نہیں کرسکے، ماڈرن تعلیمات دے کر مسلمانوں کو دینی تعلیمات سے ضرور دور کردیا، لیکن ان کے دل سے عشق مصطفوی کی سوزش کو نہ چھین سکے۔

اسی طرح مستشرقین کے طے کردہ خطوط پر چل کر اور ان کی جاسوسی کا فائدہ اٹھا کر استعمار پسند طاقتوں نے مشرق وسطی بالخصوص بلاد اسلامیہ پر اپنا تسلط ضرور قائم کرلیا، لیکن حریت پسندوں نے ان کے عزائم کو خاک میں ملادیا، اور ایک دن ان کو اپنا تسلط کھونا ہی پڑا۔

لیکن جو کامیابی مستشرقین نے علمی میدان میں حاصل کی، اس نے انہیں علمی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنادیا، ہر چہار جانب ان کی علمی دھاک بیٹھ گئی، کسی بھی علمی بحث میں ان کی تحقیق کو سند کا درجہ دیا جانے لگا۔

مستشرقین کی علمی جدوجہد میں اگرچہ بظاہر نیک نیتی جھلکتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علمی خدمت کے پس پردہ بھی اسلام کے خلاف وہی موروثی بغض وعناد اور مذہبی تعصب کارفرما تھا جو ابتدائے اسلام ہی سے یہود ونصاری کے رگ رگ میں بھرا ہوا تھا، چنانچہ علامہ پیر کرم شاہ ازہری اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

۱۔ قوی الشر المحالفۃ، ص: ۱۳۳ بحوالہ ضیاء النبی: ۶/۲۵۶؛ مطبع سابق۔

''مستشرقین کی پوری تحریک علمی لبادے میں کام کرتی ہے، یونیورسٹیوں میں علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل کرنا، دنیا کے طول وعرض میں مدارس قائم کرنا، مخطوطات جمع کرنا، مختلف کتابوں کی تحقیق کرنا، کتابوں کو شائع کرنا، عربی کتابوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنا، مختلف موضوعات پر کتابیں تالیف کرنا، یہ تمام کام علمی کاوشوں کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں، لیکن گزشتہ صفحات میں مستشرقین اور مبشرین کے جو متعدد بیانات ذکر کیے گئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان تمام علمی کاوشوں کے پیچھے علم کی خدمت کا جذبہ کارفرما نہ تھا، بلکہ علم کی خدمت کے لبادے میں دراصل اسلام اور مسلمانوں سے مقابلہ مقصود تھا، عام مستشرقین کی علمی کاوشوں کا مقصد تو یہی تھا، لیکن یہ اصول تمام مستشرقین پر لاگو نہیں ہوتا، مستشرقین میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جن کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے صرف علم کے حصول اور علم کی خدمت کے جذبے سے اپنی زندگیاں تحقیق کے خارزار میں گزار دیں۔(۱)

۔ اقتصادی مقاصد

مشرق کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا عام اہل مغرب کا معمول تھا، لیکن مستشرقین جو تشنگانِ علم وحکمت ہونے کے مدعی تھے، ان میں بھی ایک طبقہ ایسا تھا جو صرف روزی روٹی کمانے کے لئے تحریک استشراق میں شامل ہوا تھا، یہ لوگ علم وسائنس کے دیگر شعبوں میں دوسروں کا مقابلہ کرنے کی سکت اپنے اندر نہیں پاتے تھے، اس لئے استشراق کی تحریک میں شامل ہوجاتے تھے۔(۲)

بعض حضرات کے نزدیک مشرقی زبان وادب کی طرف مستشرقین کی توجہ کا آغاز ہی اقتصادی اور تجارتی مقاصد کی حصولیابی کا نتیجہ تھا، چنانچہ علامہ پیر کرم شاہ ازہری لکھتے ہیں:

''اہل مغرب خصوصاً اٹلی کے لوگوں کے مشرقی ممالک کے ساتھ قدیم تجارتی تعلقات تھے اہل مشرق کے ساتھ اپنے تجارتی معاملات کو اچھے طریقے سے طے کرنے کے لئے انہوں نے عربی زبان کی تعلیم کو ضروری سمجھا، اسی لئے انہوں نے عربی زبان سیکھنے پر

۱۔قوی الشر المتحالفۃ، ص:۱۳۳ بحوالہ ضیاء النبی:۶/ ۲۵۶؛ مطبع سابق۔

۲۔ضیاء النبی:۶/ ۲۷۵؛ مطبع سابق۔

خصوصی توجہ دینا شروع کردی، ان کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۲۶۵ھ میں تونس اور اٹلی کے شہر پیزا کے تاجروں کے درمیان جو تجارتی معاہدہ ہوا اسے عربی زبان میں لکھا گیا۔"(۱)

اس حقیقت کی مزید نقاب کشائی کرتے ہوئے علامہ پیر کرم شاہ ازہری خامہ فرسا ہیں:

"چونکہ ممالک شرقیہ اسلامیہ میں بہت سے فوائد اہل مغرب کو اپنی طرف متوجہ کررہے تھے، اس لئے ان فوائد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اہل مشرق کی زبانوں جغرافیہ، زرعی مسائل، انسانی خصوصیات اور ان کے دیگر حالات سے آگاہی حاصل کریں، تاکہ جب وہ اپنے مختلف مقاصد کی خاطر مشرق کا سفر کریں، تو انہیں مشرقی لوگوں سے میل جول اور لین دین میں آسانی ہو، یہی وجہ تھی کہ مالی کمپنیاں، تجارتی ادارے اور حکومتیں ان علاقوں کے تفصیلی جائزہ کے لئے باقاعدہ مہمیں روانہ کرتی تھیں، چونکہ انسانوں کے رویے اور اخلاق میں ان کا دین اہم کردار ادا کرتا ہے، اس لئے مشرقی ادیان خصوصاً دین اسلام کی طرف بھی خصوصی توجہ دیتے تھے، وہ اسلام کے موضوع پر کتابیں لکھتے، اور دین سے متعلقہ کتابوں پر تحقیق کرتے تھے۔"(۲)

۔ سیاسی مقاصد

اہل مغرب نے جب بلاد شرقیہ پر استعمارانہ تسلط کا ارادہ کیا، اس وقت انہیں اہل مشرق کی تہذیب وتمدن، اور ان کی عادات واطوار سے آگہی حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی، علاوہ ازیں انہیں کچھ ایسے دانشوروں کی بھی ضرورت محسوس ہوئی جو اہل مشرق کے درمیان رہ کر ان کی خوبیوں اور خامیوں کا مطالعہ کریں اور پھر استعمار پسند طاقتوں کے استعماری عزائم کی تکمیل کی راہ ہموار کریں، اس اہم کام کے لئے ان کی نظر انتخاب مستشرقین پر پڑی، جو ہر لحاظ سے ان کے مقصد کی تکمیل میں ان کا تعاون کرسکتے تھے، چنانچہ علامہ پیر کرم شاہ ازہری فرماتے ہیں:

۱۔ضیاء النبی:۶/ ۲۸۰؛ مطبع سابق۔

۲۔الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری، ص:۲۰۷۔

''اقوامِ مغرب کے مشرق میں سیاسی مقاصد کو صرف دو عنوانوں کے تحت بیان کیا جاتا ہے: (۱) سارے عالم اسلام پر سیاسی غلبہ؛ (۲) مملکت اسرائیل کا قیام، جن لوگوں کو اس مقصد کے لئے میدان میں اتارا گیا، ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، ایک طبقہ وہ تھا جنہوں نے علم کے شیدائیوں کا بھیس بدلا، اس طبقے کو مستشرقین کا نام دیا گیا، دوسرا گروہ وہ تھا جنہوں نے اہل مشرق خصوصاً مسلمانوں کو مختلف تدبیروں کے ذریعہ عیسائیت کی طرف مائل کرنے کا بیڑا اٹھایا، اس گروہ کو مبشر کا خوبصورت لقب دیا گیا، ان لوگوں کو اس کام پر مامور کرنے والوں میں دنیائے عیسائیت کے تمام کلیسے بھی شامل تھے، ان میں یہود بھی شامل تھے، فرانس، جرمنی، برطانیہ، روس، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی حکومتوں نے بھی اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔'' (۱)

مولانا ابواللیث اصلاحی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''تیسرا خیال یہ ہے کہ مذکورہ بالا علمی جدوجہد حق کی جستجو یا کسی بلند اخلاقی مقصد کے بجائے یورپ کی اپنی سیاسی ضرورتوں کا نتیجہ تھی، یورپ میں علمی ترقی کے آغاز میں دنیا کے ایک بڑے حصہ پر اس کے تسلط اور مشرق پر اس کے سیاسی اقتدار کے نتیجہ میں یورپ کو مشرقی روایات وافکار سے واقفیت کی ضرورت کا احساس ہوا، مستشرقین اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے سامنے آئے۔'' (۲)

محمد اسد شہاب جدہ سعودی عرب لکھتے ہیں:

''استشراق کا دائرہ کار اور طریقہ عمل جدا جدا ہوتا ہے، مگر اس کا خاص رخ اور مطمح نظر مخصوص مصالح ومقاصد پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے اس کا معاملہ کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی ہوتا ہے، نیز کبھی وہ کسی حکومت کے زیر سایہ اپنے فرائض انجام دیتا ہے، ایسی صورت میں اس کے لئے مخصوص بجٹ بنایا جاتا ہے، اور وہ کبھی بھی اپنی حکومت کے ملکی وسیاسی مصلحتوں سے بے تعلق نہیں رہتا۔'' (۳)

۱۔ ضیاء النبی: ۶ / ۲۸۱؛ مطبع سابق۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶ / ۲۸۲؛ مطبع سابق۔

۳۔ اسلام اور مستشرقین: ۳ / ۱؛ مطبع سابق۔

پروفیسر خلیق نظامی تحریک استشراق کے چوتھے دور سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس دور کے مستشرقین اپنے ملکوں کی وزرات خارجہ کے مشیر بن گئے، اوران کی تحقیق اگرایک طرف مغربی حکومتوں کی فارن پالیسی کا رخ متعین کرنے لگی، تو دوسری طرف ان علاقوں میں خیالات کی تبدیلی لانے کے لئے وزرات خارجہ ان مستشرقین سے مدد لینے لگی، جو کام کبھی سپاہیوں کے ذریعہ انجام پاتا تھا اب پروفیسروں کے ذریعہ انجام پانے لگا۔''(۱)

قاضی زین العابدین میرٹھی لکھتے ہیں:

''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دانشور ہیں جنہوں نے ایشیا اورافریقہ پر مغربی اقوام پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے ایشیائی اور اسلامی علوم وفنون کی طرف توجہ کی، جیسا کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ہوا، کہ ۱۷۸۴ء میں کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا، اوردہلی میں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں دہلی کالج اور اس سے متعلق دارالترجمہ کی تاسیس کی گئی، جہاں ایک طرف انگریزی حکومت کی مشینری کے لئے ہندوستانی پرزے ڈھالے گئے، تو دوسری طرف نووارد مغربی حاکموں کو اپنی مشرقی رعایا کی زبان، تاریخ، تمدن اور تہذیب سے روشناس کرانے کا سامان کیا گیا۔''(۲)

ڈاکٹر اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صراحت سے لکھا ہے کہ لندن میں مشرقی وافریقی علوم کا ادارہ صرف برطانوی سامراجیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے، اسی قسم کے خیالات انہوں نے حافظ فضل الرحمن انصاری کے نام ایک خط میں ظاہر کئے ہیں۔''(۳)

محمد اسد شہاب جدہ ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۱۶؛ مطبع سابق۔

۲۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۱۸۶؛ مطبع سابق۔

۳۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۷۶؛ مطبع سابق۔

"اس ادارہ (ادارۂ اقوام ایشیا) کا مقصد بھی وہی ہے جو سوسائٹی کا ہے، البتہ یہ ادارہ ان تمام مقالات کو جو مستشرقین روس کا حاصل مطالعہ اور نتیجۂ تحقیق ہوتے ہیں جانچنے اور پرکھنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی مجلس اعلیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے، اور ان ہی مقالات کی روشنی میں عرب اور اسلامی دنیا کے بارے میں روس کی خارجہ پالیسی اپنا طریقۂ کار اختیار کرتی ہے، اس ادارہ کو نامور روسی مستشرقین کے تحت رکھا جاتا ہے۔" (۱)

سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مستشرقین نے جو طریقۂ کار اپنائے، ان میں سے چند یہ ہیں۔

☆ تعلیم وتدریس، اشاعت کتب، علمی مہموں اور کھدائیوں وغیرہ کے ذریعہ عالم اسلام کا تمام پہلوؤں کو صحیح صحیح سمجھنا۔

☆ مسلمانوں کے باہمی اتحاد وقوت کو کمزور کرنا۔

☆ عقیدے کے اوپر مسلمانوں کی گرفت کو کمزور کرنا، اس کے لئے انہوں نے نبی اکرم ﷺ اور قرآن وحدیث نیز فقہ وتفسیر پر اعتراضات کرکے ان کو مشکوک بنانے کی کوشش کی۔

☆ ایسی تعلیم دینا جو مسلمانوں کو مسلمان نہ رہنے دے۔

☆ پوری دنیا کو مغربی تہذیب کا دلدادہ بنا کر ان کے اندر سے حریت اور قوت وشجاعت کو ختم کرنا۔ (۲)

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے استعماری طاقتوں نے مستشرقین اور مبشرین پر پانی کی طرح روپیہ بہایا، ان تنظیموں نے اس دولت کے بل بوتے پر تعلیمی اداروں، ہسپتالوں، فلاحی اداروں، غریبوں اور محتاجوں کے لئے امدادی منصوبوں، اخبارات ورسائل، کتابوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی بھرپور کوشش کی۔ (۳)

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۳/۵؛ مطبع سابق۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۲۸۴؛ مطبع سابق۔

۳۔ ضیاء النبی: ۶/ ۲۸۴؛ مطبع سابق۔

ان تدابیر کی بدولت جب مسلمانوں کا اعتماد اپنی ذات سے، اپنی قوم سے اور اپنے دین سے اٹھ گیا، تو اہل مغرب کو عالم اسلام میں کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا، انہوں نے اقوام مشرق خصوصاً ممالک اسلامیہ کو اپنے استبدادی پنجے میں کس لیا، اور طویل مدت تک ان ممالک کو جی بھر لوٹتے رہے، اس کی وجہ صدیوں کی وہی محنت ہے جو مستشرقین نے مسلمانوں کو فکری، اخلاقی اور عملی طور پر کھوکھلا کرنے کے لئے کی ہے۔(۱)

۱۔ضیاء النبی:۶/۲۸۶؛ مطبع سابق۔

مستشرقین کے علمی کارنامے

یوں تو حاملین استشراق کا بنیادی مقصد دنیا سے دین اسلام کا خاتمہ اور دین یہودیت ونصرانیت کو آسمانی دین کی شکل میں پیش کرنا تھا، مگر اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے کافی جدوجہد کی اور انھوں نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے، جنھیں دیکھ کر عام آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ایک ایسی جماعت جس کا مطمح نظر اسلام کو جڑ سے ختم کرنا ہو وہ اسلامی علوم وفنون کی اتنی زبردست خدمت کیسے انجام دے سکتی ہے؟ لیکن رب تعالیٰ کی شان قدرت دیکھیے کہ اس نے ان اسلام دشمنوں سے ایسے ایسے کام لے لیے، جن کا صدور خود مسلمانوں سے محال نہیں تو مشکل ضرور تھا، مستشرقین کی علمی خدمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ:

"مستشرقین نے علوم اسلامی پر کام کرنے میں جس بے پناہ لگن، غیر معمولی انہماک اور مسلسل جدوجہد کا ثبوت دیا اور اپنی پوری پوری زندگیاں مختلف اسلامی علوم وفنون کے مطالعہ میں بسر کردیں، اس کو نظر انداز کرنا حق اور دیانت کے خلاف ہوگا، مولانا ابوالکلام آزاد نے مستشرقین کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا "تاریخ وادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کے الگ کردینے کے بعد عربی، اور مسلمانوں کا کشکول خالی ہوجاتا ہے، صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آرہی ہیں۔" (۱)

مستشرقین کی علمی خدمات کو ہم مندرجہ ذیل سرخیوں کے تحت بیان کررہے ہیں:

(۱) ممالک اسلامیہ سے نادر مخطوطوں اور مسودوں کا جمع کرنا۔

(۲) نایاب اسلامی کتابوں کی نشرواشاعت۔

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۲۳؛ مطبع سابق۔

(۳) اہم اسلامی موضوعات پر گراں قدر کتابوں کی تصنیف۔

(۴) اسلامی کتب کا انگریزی یا لاطینی زبان میں ترجمہ۔

(۵) معاجم وفہارس کی ترتیب۔

بلادِ اسلامیہ سے نادر مخطوطوں اور مسودوں کا جمع کرنا

ابتدائے اسلام سے ہی دین اسلام کی حفاظت وصیانت ایسے باذوق افراد کے ہاتھوں میں قدرت نے دے رکھی تھی، جنھوں نے اپنے علمی کارناموں سے پوری دنیا کو فیض یاب کیا، ایسے ایسے علمی جواہر پارے ان کی نوک قلم نے جنم دیے، جنھیں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمان اپنے اس قیمتی ورثے کی حفاظت خود کرتے مگر افسوس کہ اسلام کے دورِ انحطاط میں اس ورثے کی طرف انھوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی، ناقدری بہت بڑا جرم ہے، اس لیے اس جرم کی سزا کے طور پر رب قدیر نے ان علمی سرمایوں کی طرف مغربی محققین کا عنانِ التفات موڑ دیا، مستشرقین نے اس علمی سرمایے کو ممالک شرقیہ کے کونے کونے سے اکٹھا کیا، جو مسلمانوں کی ناقدری کی وجہ سے ردی کے بھاؤ بک رہا تھا، یا تنگ وتاریک کوٹھریوں میں دیمک کی خوراک بن رہا تھا، مختلف علوم وفنون کے متعلق کتابیں اور مخطوطے اہل مغرب نے کوڑیوں کے بھاؤ مسلمانوں سے خریدے اور انھیں مغربی ممالک میں منتقل کر دیا۔(۱)

اہل مغرب کے اندر اس کام کو لے کر کتنی دل چسپی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کے لیے مغربی تجارتی کمپنیوں کے جو جہاز مشرقی ممالک کا سفر کرتے، بعض یورپی حکومتیں ان کو یہ فرض سونپتیں کہ وہ اسلامی ممالک سے کچھ مخطوطے ضرور اپنے ساتھ لائیں۔(۲)

اس عظیم کام کی اہمیت کے پیش نظر مستشرقین، مغربی حکومتیں، ان کے سفارت کار، عیسائیت کے تبلیغی مشن اور یہودیوں کی مختلف تنظیمیں ممالک شرقیہ کے مخطوطات جمع کرنے

۱۔ ضیاء النبی: ۶/ ۳۰۳، مطبع سابق۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۳۰۳، مطبع سابق۔

کے کام میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے لگیں، انھوں نے مخطوطات کو مغربی ممالک میں منتقل کرنے کے لیے قانونی اور غیر قانونی ہر قسم کے ذرائع استعمال کیے، ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج لاکھوں کی تعداد میں اسلامی اور مشرقی مخطوطات یورپ کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

مستشرقین نے ان مخطوطوں کو جمع کر کے بطور زینت انھیں جوں کا توں الماریوں میں سجایا نہیں بلکہ باقاعدہ ان کی حفاظت وصیانت کا انتظام کیا، ان کی فہرستیں تیار کیں، ان کے پیچیدہ مقامات کی تشریح وتوضیح کی، ان پر حواشی لگائے، اوران کے علوم وفنون سے بھرپور استفادہ کیا۔ چنانچہ الاسلام والمستشرقون میں ہے:

"جمع المخطوطات العربية من كل مكان وبشتى السبل ,والعمل على حفظها وصيانتها من التلف ,والعناية بها عناية فائقة, و فهرسته فهرسة نافعة تصف المخطوطات و صفاد قيقا ,و قد قام مثلا "الوار" بوضع فهرس المخطوطات العربية فى مكتبة برلين فى عشرة مجلدات, بلغ فيه الغاية فنا ودقة وشمولا وصدرهذا الفهرس فى نهاية القرن الماضى و اشتمل على فهرس لنحو عشرة آلاف مخطوط, و قدقام المستشرقون فى كافة الجامعات والمكتبات الاوربية بفهرسة المخطوطة العربية فهرسة دقيقة۔"(۱)

مختلف جگہوں سے مختلف طریقوں سے عربی مخطوطات کا جمع کرنا، ان کو برباد ہونے سے بچانا، ان کی طرف نہایت توجہ دینا، ان کی ایسی فہرست تیار کرنا جو مکمل طور سے مخطوطات پر روشنی ڈالتی ہو مثلاً 'الوار' نے برلن میں دس جلدوں میں عربی مخطوطوں کی ایک فہرست تیار کی، جس میں زبردست فن کاری، گہرائی اور شمولیت کا لحاظ رکھا، یہ فہرست گزشتہ صدی کے اخیر میں شائع ہوئی، جو تقریباً دس ہزار مخطوطوں کی فہرست پر مشتمل تھی، اسی طرح مستشرقین نے تمام یونیورسٹیز اور لائبریریوں میں مخطوطات کی عمدہ فہرستیں تیار کیں۔

مخطوطات کے جمع کرنے میں مستشرقین نے کافی جانفشانی کی، ان کی جدوجہد اور جگر سوزی ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ایک اندازے کے مطابق یورپ کی لائبریروں میں موجود

۱۔ الاسلام والمستشرقون، ص: ۸۵۔

مخطوطات کی تعداد دسیوں ہزار تک ہے، بلکہ ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے، چنانچہ الاسلام والمستشرقون میں ہے:

"وتقدر المخطوطات العربية الاسلامية فی مکتبات اوربا بعشرات آلاف بل قد یصل عددها الی مئات آلاف۔"(۱)

یورپ کی لائبریروں میں موجود اسلامی عربی مخطوطوں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق دس ہزار ہوگی، بلکہ ان کی تعداد سیکڑوں ہزار تک پہونچتی ہے۔

نایاب اسلامی کتابوں کی نشر واشاعت

مستشرقین کے اہم علمی کارناموں میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے مشہور اسلامی مصنفین، مولفین، متکلمین، فلاسفہ، محدثین، مفسرین، اور حکما ومناطقہ کی وہ کتابیں جنھیں گردش ایام نے دنیا کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا، انھیں دوبارہ منصۂ شہود پر لانے کا کام انجام دیا، وہ کتابیں جنھیں مستشرقین نے تحقیق وتفحص کے بعد شائع کیا، ان کی ایک نامکمل فہرست ملاحظہ ہو:

سیرت ابن ہشام، سیوطی کی اتقان، واقدی کی المغازی، زمخشری کی کشاف، تاریخ الملوک، کتاب سیبویہ، سمعانی کی الانساب، یاقوت کی معجم الادباء، ابن مسکویہ کی تجارب الامم، ابن عبدالحکم کی فتوح مصر والمغرب والاندلس، ابونصر السراج کی اللمع، شہرستانی کی الملل والنحل، واقدی کی فتوح الشام، ابن حجر کی الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ، غزالی کی فضائح الباطنیۃ، تاریخ الیعقوبی، صحیح البخاری، اصفہانی کی الاغانی، سیوطی کی الاوائل، طبقات ابن سعد، امام ابوحنیفہ کی الفقہ الاکبر، اشعری کی مقالات الاسلامیین، ابن قتیبہ کی عیون الاخبار، وغیرہ۔(۲)

کتابوں کی نشر واشاعت کی یہ کوشش کبھی اجتماعی شکل میں ہوئی تو کبھی انفرادی، چنانچہ فلوگل نامی مستشرق نے تن تنہا عربی کی تقریباً پچاس کتابیں شائع کیں، سید سلیمان ندوی

۱۔ الاسلام والمستشرقون: ص:۸۵؛ مطبع سابق۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۳۰۵؛ مطبع سابق۔

اس کی کوششوں کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کی کوشش اور سعی سے عربی زبان کی تقریبا پچاس کتابیں شائع ہوئیں، ان میں سب سے بہتر اور سب سے گراں مایہ اور سب سے زیادہ قابل قدر حاجی خلیفہ چلپی کی 'کشف الظنون' کی سات ضخیم جلدیں مع ترجمہ لاطینی وفہرست وملحقات، اور کتاب الفہرست ابن ندیم مع فہرست ومقدمہ ہیں، کشف الظنون عربی علوم وفنون وتصنیفات کی ہزار سالہ تاریخ ہے، کتاب الفہرست مسلمانوں کی ابتدائی چار صدیوں کی علمی تاریخ کا خزانہ ہے، دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ان دونوں کتابوں کی نظیر عربی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں پیش کرسکتی ہے۔"(۱)

مستشرقین نے ان کتابوں کو جوں کا توں شائع نہیں کیا بلکہ ان کی ابتدا میں گراں قدر مقدمات لکھے، ان پر حواشی لکھے، اور ان کی ترتیب نو کا فریضہ انجام دیا، چنانچہ الاسلام والمستشرقون میں ہے:

"وكتب المستشرقون لتلك الكتب مقدمات صحيحة فيها دراسة وتقويم لتلك الكتب، كما كتبوا مقدمات الكتب طبعها نفر آخرون، واحب ان اشير هنا الى مقدمة شبر نجر على الكتاب "الاصابة فى تمييز الصحابة" لابن حجر العسقلانى، وهذا الكتاب طبع فى الهند على غير يد المستشرقين، يقول شبرنجر فى مقدمته ان فى الكتاب (الاصابة) ثمانية آلاف من صحابة رسول الله صلى الله عليه وسلم معروفين باسمائهم وانسابهم واحوال حياتهم وبما حفظ عنهم من شعر او نثر بينما المعروف من الحواريين (تلاميذ المسيح عيسى بن مريم) اثنا عشر، ثم لا نكاد نعرف عنهم الا القليل القليل۔"(۲)

مستشرقین نے ان کتابوں پر عمدہ مقدمے لکھے، جن میں ان کتابوں کا مطالعہ اور ان کی اصلاح کا لحاظ کیا گیا، یوں ہی دوسری کتابوں پر بھی مقدمے لکھے، جنھیں دوسروں نے شائع کیا، میں یہاں علامہ ابن حجر کی کتاب 'الاصابة فى تمييز الصحابة' پر اسپرنگر کے

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۵/ ۴۴۔

۲۔ الاسلام والمستشرقون، ص: ۱۳۱، مطبع سابق۔

مقدمے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، یہ کتاب ہندوستان میں مستشرقین کے علاوہ دوسروں کے یہاں سے شائع ہوئی، اسپرنگر اپنے مقدمے میں کہتا ہے کہ اس کتاب میں آٹھ ہزار ایسے اصحاب رسول کا تذکرہ ہے، جو اپنے ناموں، نسبوں اور احوال حیات اور ان سے منقول نظم ونثر سے مشہور ہیں، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے صرف بارہ حضرات ہی معروف ہیں، پھر ان کے تعلق سے ہمیں صرف تھوڑی جانکاری ہے۔

اہم اسلامی موضوعات پر کتابوں کی تصنیف وتالیف

مستشرقین نے بے شمار ایسی کتابیں خود تالیف کی ہیں، جن کا تعلق مشرق اور خصوصاً اسلام سے ہے، انیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے لے کر بیسوی صدی کے وسط تک ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں مستشرقین نے مشرقی موضوعات پر جو کتابیں تالیف کیں، ان کی تعداد ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ہے۔(۱)

ذیل میں ہم ایسی چند کتابوں کا تذکرہ کر رہے ہیں جنہیں مستشرقین نے لکھیں، اور جنہوں نے علمی دنیا میں زبردست انقلاب برپا کیا۔

☆ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ: یہ کتاب مستشرقین کی اجتماعی جد وجہد، اور کدوکاوش کا نتیجہ ہے، اگرچہ اس میں چند مسلم دانشوروں کے مقالے بھی ہیں، پھر بھی اکثر مقالے مستشرقین ہی کے ہیں، اس کو اسلامی معلومات وحقائق کا سب سے بڑا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے، آج بعض اسلامی ممالک اس کو اسلامی معلومات کی بنیاد مانتے ہیں، اس کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

☆ تاریخ آداب العرب:

اس کتاب کا اصل انگریزی نام A Literary History of Arabs ہے، اس کے مصنف کا نام R.A.Nicholson ہے۔

تاریخ العرب والاسلام:

اس کتاب کے مصنف کا نام DR. P.K. Hitti ہے، اس کتاب کا اصل انگریزی

۱۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ؛ ص:۷۸؛ مطبع سابق۔

نام History of Arabs And Islam ہے۔

☆ تاریخ لآداب العربیۃ:

اس کتاب کے مصنف مشہور مستشرق کارل بروکلمان Carl Brockleman ہیں۔

اسلامی شریعت وقانون کا تعارف:

اس کا اصل انگریزی نام Introduction to Islamic Theology and Law ہے، اس کے مصنف کا نام گولڈ زیہر Gold Ziher ہے۔

☆ مصادر الفقہ الاسلامی:

اس کا اصل انگریزی نام Islam in Modern History ہے، اس کے مصنف معروف مستشرق ڈاکٹر اسمتھ ہیں۔

☆ وجہۃ الاسلام:

اس کا انگریزی نام Whither Islam ہے، اس کے مصنف پروفیسر گبA.R. Gibb ہیں۔

☆ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی مکۃ:

اس کا انگریزی نام Mohammad in Macca ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک دوسری کتاب 'محمد ﷺ فی المدینۃ' ہے جس کا نام Mohammad in Madina ہے، ان کتابوں کے مصنف معروف سیرت نگار مستشرق منٹگمری واٹ ہیں۔

اسلامی کتب بالخصوص قرآن حکیم کا ترجمہ

اسلامی موضوعات پر جو کتابیں تالیف کی گئی تھیں، ان میں اکثریت ان کتابوں کی تھی جو عربی یا فارسی زبان میں تھیں، جب مستشرقین نے ان کتابوں کے مطالعہ کی طرف توجہ دی تو سب سے بڑی رکاوٹ ان کے سامنے یہ پیش آئی کہ وہ عربی یا فارسی زبان سے بالکل نابلد تھے، اس کے لئے انہوں نے اولاً عربی وفارسی زبانوں پر عبور حاصل کیا اور پھر ان اسلامی کتابوں کا ترجمہ کیا، جو ان کی زبان میں نہیں تھیں، تاکہ وہ اہل توریت جن کے پاس

زبان کے سیکھنے کا وقت نہیں ہے یا اس سے دلچسپی نہیں ہے، وہ بھی آسانی کے ساتھ اسلامی حقائق و معلومات سے روشناس ہو سکیں۔

جن کتابوں کا ترجمہ مستشرقین نے کیا ان میں تاریخ ابی الفداء، تاریخ الطبری، مسعودی کی مروج الذہب، مقریزی کی تاریخ الممالیک، سیوطی کی تاریخ الخلفا، امام غزالی کی احیاء العلوم اور المنقذ من الضلال جیسی کتابیں قابل ذکر ہیں۔(۱)

سب سے زیادہ توجہ مستشرقین نے قرآن کریم کے ترجمے کی طرف دی، چنانچہ ۱۱۴۳ء میں پطرس محترم کی ایما پر پہلی مرتبہ قرآن حکیم کا لاطینی زبان میں ترجمہ مکمل ہوا، جس کا مترجم ایک انگریز عالم رابرٹ آف کیٹن تھا، پطرس محترم نے اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا۔(۲)

اس ترجمے کے بعد مستشرقین نے مغربی زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم کے ڈھیر لگا دیے، قرآن حکیم کے چودہ ترجمے جرمن میں، دس ترجمے انگریزی میں، نو ترجمے ہسپانوی زبان میں، سات ترجمے لاطینی زبان میں، اور چھ ترجمے ڈچ زبان میں ہوئے۔(۳)

جارج سیل نے انگریزی زبان میں سب سے پہلی بار قرآن کا ترجمہ ۱۷۳۴ء میں کیا، اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں اس نے لکھا ہے کہ اس سے قبل جو لاطینی زبان میں ترجمے تھے، ان میں اصل سے انحراف تھا، بیلی انڈر نے جو ترجمہ لاطینی زبان میں ۱۵۴۳ء میں کیا اس کو ترجمہ نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ اس میں اتنی کثیر غلطیاں ہیں اور اتنی جسارت سے کام لیا گیا ہے اور اتنی چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے یا تبدیلی کی گئی ہے کہ اس کو اصل سے کوئی مطابقت یا مماثلت نہیں۔(۴)

یوں ہی Andred Arriuaqbene نامی مستشرق نے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا، جس کے متعلق جارج سیل نے کہا کہ وہ اور بھی ناقص ہے، اور جو ترجمہ Andrewduryer نے فرانسیسی زبان میں کیا ہے، وہ کسی طرح ترجمہ کہلانے کے لائق

۱۔ ضیاء النبی: ۶/ ۱۴۳؛ مطبع سابق۔

۲۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ: ص: ۷۷؛ مطبع سابق۔

۳۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ: ص ۷۸؛ مطبع سابق۔

۴۔ قرآن اور مستشرقین، مشمولہ اسلام اور مستشرقین: ۱/ ۱۰۹؛ مطبع سابق۔

نہیں، کیونکہ اس کے ہر صفحہ پر بے شمار غلطیاں ہیں، جابجا تحریف یا اضافے ہیں، اور آیتوں کو مسخ کیا گیا ہے، جو نا قابل معافی جرم ہے، اسی فرانسیسی ترجمہ کا الگونڈر نے انگریزی میں کیا، جس کے متعلق جارج سیل کی رائے یہ ہے کہ وہ عربی زبان مطلق نہیں جانتا تھا اور نہ اس کو فرانسیسی زبان پر عبور تھا، اس نے اصل مترجم کی غلطیوں میں اپنی طرف سے اضافہ کیا اور بہت ہی مذموم زبان استعمال کر کے ترجمہ کو مضحکہ خیز بنادیا، Father Lewis Marrdeel نے لاطینی زبان میں ۱۶۶۵ء میں ترجمہ کیا تھا، جس کے متعلق جارج سیل نے لکھا ہے کہ اس ترجمہ میں تمام تر تکرار ہے، جس کی وجہ سے ضخامت بڑھ گئی ہے، کہیں کہیں زبان میں جسارت اور گستاخی سے کام لیا گیا ہے۔(۱)

اسی طرح سے دہری، رچرڈ بل، ابری اور پکتھال نے قرآن کریم کے ترجمے کئے، اور فاش غلطیوں سے اپنے ترجموں کو محفوظ نہ رکھ سکے، پکتھال نے جو غلطیاں کی ہیں وہ عبارتی ہیں اور عربی زبان میں قرآن کے اسلوب اور عربی محاوروں سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کی ہیں، اربری کی غلطیاں ترجمہ میں اصل کی طرح موسیقیت اور نغمہ بھرنے کی کوشش کی وجہ سے ہوئیں، اور کچھ عربی محاوروں سے ناواقفیت کی بنیاد پر ہوئیں، اوروں نے دیدہ ودانستہ اور بدنیتی سے فاش غلطیاں کیں۔(۲)

سیوری Savery نے ۱۷۵۲ء میں قرآن کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا، اور اس میں آپ ﷺ کی مختصر سوانح بھی لکھی، آنحضرت ﷺ کے لئے نرم الفاظ استعمال کئے، اور آپ ﷺ کو تاریخ کی غیر معمولی شخصیت بھی قرار دیا، مگر ازمنۂ وسطیٰ کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہ کرسکا، اسی لئے کہا کہ آپ ﷺ نے یہودیت اور عیسائیت سے عقیدۂ توحید کو مستعار لے کر مذہب اسلام کی داغ بیل ڈالی۔

قارئین کرام کے سامنے ہم نے اب تک مستشرقین کے ذریعہ کئے گئے ترجمۂ قرآن سے متعلق جو تفصیل پیش کی ہے، اس سے بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ان تراجم کا مقصد نہ تو احقاق حق تھا اور نہ ہی حق کی تلاش وجستجو، ان کوششوں کا داعیہ قطعاً یہ نہیں تھا کہ ان تراجم

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۱/ ۲۰۹۔

۲۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ، ص: ۳۲۔

کی مدد سے دیگر حضرات قرآن کی اصل روح کو سمجھ کر اس کی حقانیت کا اعتراف کریں، بلکہ ان تراجم سے پطرس محترم اور اس کے ساتھیوں کا مقصد دین اسلام کی مخالفت کے لئے عیسائیوں کو مواد فراہم کرنا تھا جس کا اعتراف خود پطرس محترم نے کیا تھا۔ چنانچہ علامہ پیر کرم شاہ ازہری فرماتے ہیں:

''پطرس کے نزدیک قرآن کے ترجمہ کا مقصد یہ ہے، کہ عیسائیوں کو مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مضبوط دلائل میسر آسکیں، اور ان دلائل کے زور پر وہ اپنے ایمان اور عقیدے پر قائم رہ سکیں۔''(۱)

علاوہ ازیں ان تراجم کا مقصد یہ بھی ہے کہ ترجمہ کی شکل میں قرآن میں اس قدر تحریف اور حذف واضافہ کر دیا جائے، کہ لوگوں کو یہ احساس ہونے لگے کہ قرآن اللہ کی کتاب نہیں ہے، نیز اصل قرآنی عبارت میں جو چاشنی اور مٹھاس ہے، ترجمہ کر کے اس چاشنی اور مٹھاس کو عوام کے سامنے آنے سے روکا جائے، ظاہر ہے کہ لوگ ترجمہ ہی پڑھیں گے، اصل قرآن کو دیکھیں گے نہیں، تو قرآن کی فصاحت وبلاغت سے وہ نابلد رہیں گے، اور اس طرح سے قرآن کے وجوہ اعجاز میں سے ایک بنیادی وجہ یعنی قرآنی فصاحت وبلاغت سے لوگ محظوظ نہ ہوسکیں گے۔

❁❁❁

۱۔ضیاءالنبی:۶/۳۵۱۔

باب دوم

قرآن کریم اور مستشرقین

- قرآن کریم سے متعلق مستشرقین کے عام نظریات
- قرآن کے کلام خداوندی ہونے پر اعتراضات
- اختلاف قراءت پر مستشرقین کے اعتراضات
- ناسخ و منسوخ آیات پر اعتراضات
- تدوین قرآن پر اعتراضات
- مستشرقین کے متفرق اعتراضات اور ان کے جوابات

قرآن کریم سے متعلق مستشرقین کے عام نظریات

اسلامی احکام وقوانین کا سب سے اہم ماخذ قرآن کریم ہے، اس کی اہمیت کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ خالق کائنات کا کلام بے مثیل ہے، بوسیلۂ وحی حضرت جبرئیل امین کے ذریعہ اللہ کے مقدس حبیب محمد رسول اللہ ﷺ پر اس کا نزول ہوا۔

مستشرقین کی عقابی نگاہوں سے اس مقدس کتاب کی اہمیت وافادیت اوجھل نہیں تھی، وہ جانتے تھے کہ اسلامی منشور کے ماخذ اول کی حیثیت کو مشکوک کردینے کے بعد اسلام اور اہل اسلام کی شوکت کو پامال کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

ان کو معلوم تھا کہ جب تک قرآن حکیم موجود رہے گا، اور مسلمانوں کو یقین رہے گا کہ اسی کتاب کی پیروی میں ان کی دنیا وآخرت کی کامیابی موجود ہے، اس وقت تک اسلام کو نقصان پہونچایا جاسکتا ہے اور نہ ہی ملت اسلامیہ کو قوت وشوکت سے محروم کیا جاسکتا ہے۔(۱)

ان کی نظر میں اس کلام معجز بیان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا مطلب توریت و انجیل کے ان محرف عقائد ونظریات کا انکار تھا، جن کی قرآن کریم نے جابجا تردید کی ہے، اور جن کے بل بوتے ان کی خود ساختہ عظمت وبرتری کا بھرم قائم تھا، کیوں کہ قرآن کریم موجودہ توریت وانجیل کے متعلق کہتا ہے کہ یہ دونوں تحریف شدہ ہیں، قرآن نے توریت وانجیل کی پیش کردہ خرافات کی صحیح نقاب کشائی کی، عقیدۂ توحید سے متعلق قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ توحید ہی دین حق کی روح ہے، عقیدۂ تعدد الٰہ اور عقیدۂ تثلیث اس روح کے منافی عقائد ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن نے کہا کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے، خدا نہ

۱۔ضیاء النبی:۶/ ۳۵۳؛ مطبع سابق۔

تھے، عیسائیوں کے عقیدے کے برخلاف ان کو نہ قتل کیا گیا، نہ سولی دی گئی، بلکہ انہیں آسمان پر اٹھالیا گیا، قرآن نے اس مضحکہ خیز عقیدہ کی بھی تردید کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مصلوب ہوکر ساری قوم کی نجات کا سامان فراہم کردیا، قرآن نے اس تصور کو بھی باطل قرار دیا کہ کوئی خاص قوم خدا کی محبوب قوم ہے۔(۱)

مستشرقین جن کی اکثریت یہودیت اور عیسائیت سے متعلق تھی ان کی انانیت اور تعصب انہیں اس بات کی کہاں اجازت دیتا کہ قرآن کریم کی صداقت کو مان کر ان سارے مذکورہ عقائد کا خون کردیتے، اور اس طرح سے وہ اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے ہوئے اپنی عظمت کے تاج محل کو مسمار کردیتے، یہ ہٹ دھرمی انہیں وراثت میں ملی تھی، تاریخ شاہد ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میمون میں بھی یہود ونصاریٰ کو بخوبی معلوم تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اور آپ وہی نبی برحق ہیں جن کی بشارت توریت وانجیل میں موجود ہے، پھر بھی اس کھلی حقیقت سے مکرتے ہوئے انہوں نے آپ کی رسالت ونبوت سے انکار صرف اس ناتے کیا تھا کہ آپ کو رسول خدا کی حیثیت دینے کے بعد خود ان کی حیثیت کے لالے پڑ جاتے، اور عرب وعجم میں ان کی چودھراہٹ کی عمارت زمین بوس ہوجاتی۔

قرآن حکیم کی مخالفت کی ایک وجہ اور بھی ہے، وہ یہ کہ قرآن مسلمانوں کے دلوں میں ولولہ انگیز بیانات کے ذریعہ شجاعت وحریت اور جہاد وجواں مردی کی روح پھونکتا ہے، اور ان کو یہ سبق دیتا ہے کہ اگر کوئی شر پسند طاقت محض ملک گیری کی خواہش کے ناتے تم کو اور تمہاری قوم کو اپنی غلامی کی زنجیروں کا اسیر بنانا چاہے، تو اس کے خلاف سینہ سپر ہوجاؤ اور اس کے ناپاک عزائم کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دو، ظاہر ہے یہ قرآنی تعلیمات استعمار پسند طاقتوں کے عزائم کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں، اس لئے مستشرقین جو کہ مستعمرین کا ہراول دستہ تھے، انہیں یہ سمجھنے میں دقت نہیں محسوس ہوئی کہ جب تک یہ قرآن امت مسلمہ کی رگوں میں شجاعت وحریت کے لہو کو گرمی عطا کرتا رہے گا، تب تک استعماری طاقتیں اپنی منزل نہیں پاسکتی ہیں، برطانیہ کے ایک سابق وزیر اعظم نے تو صاف لفظوں میں کھل کر کہا:

"جب تک قرآن مسلمانوں کے پاس موجود ہے، اس وقت تک ہمارے

۱۔ مستشرقین اور اسلام، مشمولہ اسلام اور مستشرقین، ص: ۸۸، ۸۹، مطبع سابق۔

استعماری عزائم کے پایۂ تکمیل تک پہونچنے کا کوئی امکان نہیں۔‘‘(۱)

اور اسی حقیقت کا اعتراف مشہور مستشرق ’ہنری ہاملٹون توماس‘ (Henry Hamilton Thomas) نے اپنی معروف کتاب ’Late Ripellion in India And our Future Policy‘ میں کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے:

’’مسلمان کسی غیر اسلامی حکومت کی وفادار رعایا ہو ہی نہیں سکتے، کیوں کہ یہ چیز قرآنی احکام کی رو سے محال ہے۔‘‘(۲)

مستشرقین نے قرآن حکیم کی اہمیت کم کرنے کے لئے مختلف زاویوں سے اس کتاب مبین پر وار کئے، انہوں نے بیک زبان ہو کر اعلان کیا کہ قرآن حکیم خدا کا کلام نہیں، بلکہ یہ حضرت محمد ﷺ کی اپنی تصنیف ہے، انہوں نے قرآن حکیم کی تدوین اور حفاظت پر اعتراض کر کے اس کے مستند دستاویز ہونے کا بھی انکار کیا، انہوں نے قرآن حکیم کی فصاحت وبلاغت اور اس کی شان اعجاز پر بھی طبع آزمائی کی، انہوں نے اس کے مضامین، اس کی ترتیب اور اس کے اسلوب کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، قرآن حکیم کی تعلیمات بھی مستشرقین کے طعن وتشنیع کے تیروں سے محفوظ نہ رہ سکیں۔(۳)

علاوہ ازیں ان دریدہ دہنوں نے قرآن کریم کی مختلف قراءتوں پر بھی اعتراض کیا ہے، اس کے اندر موجود ناسخ ومنسوخ آیتوں کو بھی اپنے اعتراضات کا ہدف بنایا ہے۔

جہاں تک قرآن کی فصاحت وبلاغت کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن کی فصاحت وبلاغت جس طرح عہد رسالت کے فصحا وبلغا کے لئے چیلنج تھی، اسی طرح آج کے مستشرقین کے لئے بھی چیلنج ہے، قرآن آج بھی بانگ دہل مستشرقین سے کہہ رہا ہے کہ اگر تمہیں میری فصاحت وبلاغت، اور میرے اسلوب وترتیب پر اعتراض ہے تو ذرا ایک سورہ یا کم از کم ایک آیت ہی بنا کر لے آو، مستشرقین سے صرف اتنا کہوں گا کہ اگر قرآن کی فصاحت وبلاغت اور اس کا اسلوب وترتیب قابل اعتراض ہے، تو کوئی ایسی

۱۔ضیاء النبی:۶/ ۳۵۳؛طبع سابق۔

۲۔الاسلام والمستشرقون،ص:۲۲۲؛مطبع سابق۔

۳۔ضیاء النبی:۶/ ۳۵۳۔

کتاب پیش کرو جس میں فصاحت وبلاغت کا معیار قرآنی فصاحت وبلاغت سے اونچا ہو، اور جس کا اسلوب وترتیب قرآنی اسلوب وترتیب سے اعلیٰ ہو، قرآنی فصاحت وبلاغت اور اس کے اچھوتے اسلوب وترتیب کی اثر آفرینی کا اقرار کرتے ہوئے معروف مستشرق 'کونت ھنری' کا یہ تاثر پڑھئے:

''عقل محو حیرت ہے کہ ان آیات وسور کا صدور ایک امی انسان سے کیسے ممکن ہے، جن کے بارے میں تمام اہل مشرق کا اعتراف ہے کہ لفظاً ومعناً ان کی نظیر پیش کرنے سے فکر انسانی قاصر ہے، ہاں یہی وہ آیتیں ہیں کہ جب انہیں عتبہ بن ربیعہ نے سنا تو ان کے حسن میں حیران رہ گیا، اور قرآنی عبارات کی رفعت کو ثابت کرنے کے لئے وہ واقعہ کافی ہے جس میں عمر بن خطاب قرآنی آیتوں کو خاموشی سے سن کر ان کے تالی کے رب پر ایمان لے آئے، اور جس وقت جعفر بن ابو طالب نے نجاشی کے دربار میں 'سورۂ مریم' اور اس سورۃ کی تلاوت کی جس میں 'یحییٰ' کی ولادت کا ذکر ہے، تو بادشاہ نجاشی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں، اور دربار میں موجود پادری چیخ کر بول پڑا کہ بلاشبہ اس کلام کا سرچشمہ وہی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام یعنی انجیل کا ہے، 'جان روسو' نے سچ کہا ہے کہ آج کچھ یورپین جو عربی سیکھ کر قرآن کو پڑھتے ہیں، اور اس پر ہنستے ہیں، اگر وہ اس قرآن کو اس وقت سنتے جب کہ آپ ﷺ اپنی دلوں میں اثر ڈالنے والی اور کانوں کو سرور عطا کرنے والی بارعب آواز سے قرآن کی فصیح زبان کے ساتھ لوگوں کو للکار رہے ہوتے تو وہ زمین پر یہ کہتے ہوئے سجدہ ریز ہو جاتے کہ اے رسول اللہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے شرف وافتخار کی جگہ پر لے چلئے، ہم آپ کی خاطر یا تو موت کو گلے لگالیں گے، یا پھر فتح حاصل کرلیں گے۔(۱)

حیرت ہے کہ جس قرآنی فصاحت وبلاغت اور اسلوب وترتیب نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور عتبہ ونجاشی کو مسحور کر دیا تھا، بلکہ ان کے دل کی دنیا کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا تھا، آج اسی کی فصاحت وبلاغت اور اسلوب وترتیب کو مستشرقین قابل اعتراض مانتے ہیں، مستشرقین ہمیں بتلائیں کہ کیا ان کی عربی دانی، فصاحت وبلاغت اور عربی زبان کی ترتیب واسلوب کی معرفت کا معیار عہد رسالت کے فصحا وبلغا سے اونچا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں

۱۔ الاسلام والمستشرقون، ص: ۳۱۵، ۳۱۶، مطبع سابق۔

ہے، تو پھر کون سا منھ لے کر اس کلام پر طعن و تشنیع کے نشتر برسائے جاتے ہیں، جس کی فصاحت و بلاغت آج تک مسلم ہے اور صبح قیامت تک رہے گی؟ کیا یہ آپ حضرات کی ہٹ دھرمی نہیں ہے؟، ہم تو آپ کے اصل انجیل و توریت کی فصاحت و بلاغت اور اسلوب و ترتیب کو کبھی چیلنج نہیں کرتے، پھر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

مستشرقین نے قرآن پر جو اعتراضات کیے ہیں ان میں مندرجہ ذیل اعتراضات قابل التفات ہیں:

(۱) قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر اعتراض۔
(۲) قرآن کی تدوین و حفاظت پر اعتراض۔
(۳) قرآن کی مختلف قراءتوں پر اعتراض۔
(۴) قرآن کی ناسخ و منسوخ آیتوں پر اعتراض۔

ہم یکے بعد دیگرے ان اعتراضات کا ذکر کر کے ان کا جواب دے رہے ہیں، بفضلہٖ تعالیٰ۔

✿ قرآن کے کلام خداوندی ہونے پر اعتراضات

یہاں اولا ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مستشرقین قرآن کے کلام خداوندی ہونے کے کیوں منکر ہیں، جب کہ ان کی اکثریت یہودیت اور نصرانیت سے تعلق رکھتی ہے، وہ وجود خداوندی کے بھی قائل ہیں، اور اس امر کے بھی اقراری ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر کتاب بھیجتا ہے، جو اس کی امت کے لئے مشعل راہ ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوا؟

اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ پیر کرم شاہ ازہری لکھتے ہیں:

”اگر وہ قرآن حکیم کو خدا کا کلام مان لیں تو دین اسلام کی مخالفت کا ان کا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا ہے، قرآن حکیم کو کلام خداندی مان لینے کے بعد ان کے لئے حضور ﷺ کی رسالت کے انکار کی بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس صورت میں انہیں قرآن میں بیان کردہ حقائق پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے، بلکہ قرآن حکیم نے جن ملی کوتاہیوں کا پردہ چاک کیا ہے انہیں ان کا الزام بھی اپنے سر لینا پڑتا ہے، قرآن حکیم کو کلام خداوندی مان لینے

کے بعد انہیں یہودیت اور نصرانیت کا طوق اپنے گلے سے اتار کر غلامیٔ مصطفیٰ کا پٹہ اپنے گلے میں لٹکانا پڑتا ہے، انہیں خدا کی لاڈلی مخلوق ہونے کی خوش فہمی کو دور کرنا پڑتا ہے، بلکہ قرآن حکیم کو کلام خداوندی مان لینے کے بعد یورپ کی نسلی برتری کے نظریئے کا تاج محل دھڑام سے زمین بوس ہوجاتا ہے، اور اس نظریئے کے سہارے مغرب نے اپنی سیاسی چودھراہٹ کا جو ڈرامہ رچا رکھا ہے اس کا ڈراپ سین ہوجاتا ہے۔(۱)

یوں تو قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا انکار ایک ایسا نقطہ ہے جس پر تمام مستشرقین یکجا ہیں، تاہم ذیل میں ہم اس تعلق سے چند معروف مستشرقین کے خیالات پیش کرتے ہیں۔

(۱) جارج سیل اپنی کتاب "The Koran" میں لکھتا ہے:

''کلام میں لفاظی حاضرین کے ذہنوں پر جو زبردست اثر ڈالتی ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے بے خبر نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے ان نام نہاد الہامات میں اسلوب بیان کے اس وقار اور رفعت کو قائم رکھنے کے لئے اپنی پوری صلاحیتیں استعمال کی ہیں جو اس ذات کی شایانِ شان ہو جس کی طرف وہ ان کو منسوب کرتے ہیں اور اس اسلوب کو اختیار کیا ہے جو عہد نامۂ قدیم کے پیغمبرانہ اسلوب سے ہم آہنگ ہو سکے بلکہ انہوں نے فنی بلاغت کے دیگر اصولوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا، اور اس میں وہ اس حد تک کامیاب ہوئے اور انہوں نے اپنے مخاطبین کے اذہان کو یوں گرویدہ کیا کہ ان کے کئی مخالفین نے اسے جادو اور سحر کا اثر قرار دیا۔''

یہی مستشرق قرآن حکیم کے متعلق اخیر میں کہتا ہے:

''اس حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن کے مصنف یا اس کتاب کو اختراع کرنے والے محمد ہیں۔''(۲)

(۲) آرتھر جیفری نے اپنی کتاب Islam,Mohammad and His Religion میں قرآن کا تعارف یوں کرایا ہے:

۱۔ضیاء النبی:۶/۳۵۷؛مطبع سابق۔

۲۔دی قرآن،جارج سیل:ص:۵۰،مطبوعہ نیویارک:۱۸۹۰ء۔

''قرآن اسلامی صحیفہ ہے، اسے قرآن عظیم اور قرآن مجید وغیرہ کے ناموں سے پکارا جاتا ہے، لیکن اسے Holy Quran یعنی قرآن پاک نہیں کہا جا سکتا، کچھ جدید دور کے مغرب کے تعلیم یافتہ مسلمان Holy Bible کے لقب کی نقل کر کے قرآن کو بھی Holy Quran یعنی قرآن پاک کہتے ہیں، یہ کتاب محمد ﷺ کے بیس سالہ دورِ نبوت کے بیانات کے مجموعے پر مشتمل ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ محمد (ﷺ) ایک ایسی کتاب کی تیاری میں مصروف تھے جو مسلمانوں کے لئے وہی حیثیت رکھے جو یہودیوں کے لئے عہد نامہ قدیم اور عیسائیوں کے لئے عہد نامہ جدید کی ہے، لیکن اس کتاب کی تکمیل سے پہلے وہ فوت ہو گئے اور آج قرآن میں جو کچھ موجود ہے یہ وہ ہے جو ان کے بعد ان کے پیروکاروں نے جمع کیا، اور اسے محمد ﷺ کے الہامات کے مجموعے کے طور پر شائع کر دیا۔''(۱)

(۳) ڈبلیو منٹگمری واٹ Montgomery Wat اپنی کتاب Mohammad Prophet and Statesman میں لکھتا ہے:

''مسلمانوں کی روایت کے مطابق قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد ﷺ نے خود بھی یہی سمجھا ہوگا، مزید برآں یہ بھی ممکن ہے کہ محمد ﷺ یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ وہ اپنے ذاتی خیالات اور اس وحی میں تمیز کر سکتے ہیں جو خارج سے ان پر نازل ہوتی ہے، محمد ﷺ کو مخلص کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے عقائد میں ٹھیک راستے پر تھے، ایک آدمی مخلص ہو لیکن اس کے باوجود غلطی پر ہو، انسان جن خیالات کو خارج سے آتا ہوا محسوس کرتا ہے ممکن ہے وہ خیالات اس کے اپنے لاشعور سے ابھرے ہوں۔''(۲)

(۴) پروفیسر گب قرآن کریم کو وحی الٰہی کے بجائے پیغمبر اسلام ﷺ کی تصنیف سمجھتا ہے جیسا کہ اس کی کتاب 'محمڈن ازم' کے تیسرے باب کے آغاز میں اس غلط نظریئے کا اظہار کیا گیا ہے۔(۳)

مذکورہ بالا اقتباسات سے قارئین کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تمام مستشرقین کا اس

۱۔ اسلام، محمد اینڈ ہز ریلیجن، آرتھر جیفری، ص: ۴۷، مطبوعہ انڈیا: ۱۹۷۹ء۔

۲۔ محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹسمین، منٹگمری واٹ، ص: ۱۷۔

۳۔ محمڈن ازم، پروفیسر گب: آغاز باب سوم۔

بات پر اتفاق ہے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ ہر کسی کے نزدیک یہ حضور اکرم ﷺ کی تصنیف ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کلام ربانی ہے جس پر بے شمار دلائل موجود ہیں، گر کوئی ان دلائل سے چشم پوشی کر کے قرآن کو کلام خداوندی نہ مانے تو اس سے قرآن پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، آیئے ذیل میں ہم چند دلائل سے یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ غیر محرف توریت وانجیل کی طرح قرآن بھی خدا کا کلام ہے۔

(۱) قرآن کے کلام خداوندی ہونے پر سب سے بڑی دلیل اس کی شان تحدی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فصحائے عرب کو قرآن کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک بار اس طرح چیلنج دیا کہ:

"قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا"

[بنی اسرائیل:۸۸]

(اے محبوب) فرمادیجئے کہ اگر تمام انسان وجن اس کام کے لئے جمع ہو جائیں کہ قرآن کا مثل لائیں تو نہ لاسکیں گے اگرچہ ان کے بعض بعض کی مدد کریں۔

مگر کوئی بھی اس خداوندی چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوا، پھر قرآن نے ایک بار اس طرح چیلنج دیا کہ:

"قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ"

[ہود:۱۳]

یعنی اگر تم لوگ پورے قرآن کی مثل نہیں لاسکتے ہو تو قرآن جیسی دس ہی سورتیں بنا کر لاؤ۔

مگر انتہائی جدوجہد کے باوجود یہ بھی نہ ہو سکا پھر قرآن نے اس طرح للکارا:

"وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ"

[بقرہ:۲۳]

(اے حبیب) آپ فرمادیجئے کہ اگر تم لوگوں کو اس میں کچھ شک ہو جو ہم نے اپنے خاص بندے پر نازل فرمایا ہے تو تم اس جیسی ایک ہی سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام

حمایتیوں کو بلالو اگر تم سچے ہو۔

قرآن عظیم کی عظیم الشان ومعجزانہ فصاحت وبلاغت کا بول بالا تو دیکھئے کہ عرب کے تمام فصحا وبلغا جن کی فصیحانہ شعر گوئی اور خطیبانہ بلاغت کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بج رہا تھا، مگر وہ اپنی پوری کوششوں کے باوجود قرآن کی ایک سورت کے مثل بھی کلام نہ لا سکے، حد ہوگئی کہ قرآن مجید نے فصحائے عرب سے یہاں تک کہہ دیا کہ:

"فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ"

[قرآن]

یعنی اگر کفار عرب سچے ہیں تو قرآن جیسی کوئی ایک ہی بات لائیں۔

الغرض! چار چار مرتبہ قرآن کریم نے فصحائے عرب کو للکارا، چیلنج دیا، جھنجھوڑا کہ وہ قرآن کا مثل بنا کر لائیں، مگر تاریخ عالم گواہ ہے کہ چودہ سو برس کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج تک کوئی شخص بھی اس خداوندی چیلنج کو قبول نہ کر سکا اور قرآن کے مثل ایک سورت بھی بنا کر نہ لا سکا۔(۱)

مستشرقین سے میں صرف اس سوال کا جواب چاہوں گا کہ اگر قرآن کسی انسانی ذہن کی اختراع اور انسانی صلاحیت کی پیداوار ہے تو پھر اسی انسان کے معاشرہ میں رہنے والے انسان ہزار کوششوں کے باوجود اس جیسا کلام کیوں نہیں لا سکے؟ کیوں اس کی عظمتوں کے سامنے عتبہ، لبید اور عمر فاروق جیسے فصحا وبلغا سجدہ ریز ہو کر اس کو کلام خداوندی ماننے پر مجبور ہو گئے؟ کیا یہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی سب سے بڑی دلیل نہیں ہے؟

(۲) قرآن کے کلام خداوندی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس نے مستقبل کے بطن سے جنم لینے والے ایسے بہت سارے واقعات کی خبر دی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئے، قرآن کی چند پیشین گوئیاں ملاحظہ ہوں:

☆ عہد رسالت میں اس وقت کی دو سپر پاور طاقتوں ایران وروم میں زبردست ٹکر ہوئی، اہل ایران مجوس تھے، اور اہل روم عیسائی اہل کتاب تھے، مسلمانوں کو اہل کتاب ہونے کے ناتے عیسائیوں سے ہمدردی تھی، مگر اتفاق ایسا ہوا کہ اہل فارس اہل روم پر غالب

۱۔ ملخص از کتب سیر وتفاسیر۔

آ گئے، اور اہل روم کو بڑی ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا، ایک ایسے وقت میں جب کہ اہل روم اپنے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک چپہ کھو چکے تھے، فوج میں انتشار برباد ہو چکا تھا، شہروں میں بغاوت پھیل چکی تھی، کون کہہ سکتا تھا کہ رومی اب دوبارہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں گے، مگر ایسے وقت میں قرآن کی پیشین گوئی نے اس وقت کے عقلا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، قرآن نے اپنے انوکھے انداز میں پیشین گوئی کی:

"الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ"

[روم:۵-۱]

رومی مغلوب ہوئے، پاس کی زمین میں اور وہ اپنی مغلوبی کے بعد عنقریب غالب ہوں گے چند برسوں میں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ٹھیک نو سال کے بعد رومی پھر سے اہل فارس پر غالب آ گئے۔

حضور اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے جس بے سروسامانی کے عالم میں گھر بار چھوڑ کر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کیا تھا، اس صورت حال میں کس کے حاشیۂ خیال میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ایک دن یہی مفلوک الحال غریب مسلمان اہل مکہ کو ذلت ورسوائی سے دوچار کر کے ہمیشہ ہمیش کے لئے ان کی انانیت اور ہٹ دھرمی کا چراغ گل کر دیں گے، لیکن قربان جایئے، قرآن کی پیشین گوئی پر، قرآن نے ہجرت سے ایک سال قبل ہی مسلمانوں کے غالب اور کفار مکہ کے مغلوب ہونے کی خبر دی تھی:

"وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا"

[بنی اسرائیل:۷۶]

اگر وہ تم کو سرزمین مکہ سے گھرا چکے تا کہ تم کو اس سے نکال دیں تو وہ (اہل مکہ) تمہارے بعد بہت ہی کم مدت تک باقی رہیں گے۔

چنانچہ یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور ایک ہی سال بعد غزوہ بدر میں مسلمانوں کی فتح مبین نے کفارِ قریش کے سرداروں کا خاتمہ کر دیا اور کفار مکہ کی شان وشوکت

کا فلک بوس محل زمین بوس ہو گیا۔

☆یوں ہی قرآن نے مسلمانوں کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ انہیں ایک نہ ایک دن خلافت ارض یعنی دین و دنیا کی شہنشاہی کا تاج پہنایا جائے گا، ارشاد ہے:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ"

[نور:۵۵]

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین کا خلیفہ بنائے گا جیسا کہ اس نے ان کے پہلے کے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔

قرآن کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ فاقہ کشی اور غربت کے مارے مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ کی شاندار حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اللہ کی سرزمین پر ایسی شاندار حکومت کی کہ اس کے سامنے تمام سلاطین عالم کی سلطانی کے پرچم سرنگوں ہو گئے۔

مجھے مستشرقین بتائیں کہ اس طرح کی پیشین گوئیوں کا صدور کیا ایک ایسے انسان سے ممکن ہے جو امی ہو اور جو کہانت اور جادوگری سے ایک دم سے نابلد ہو؟ اگر ہاں تو پھر مستشرقین بھی انسان ہیں ان کی پیشین گوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت کیوں نہیں ہوتی ہیں اور اگر نہیں تو پھر قرآن کے کلام خداوندی ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ کیا یہ پیشین گوئیاں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں کہ جس کلام کے ذریعہ یہ پیشین گوئیاں کی جارہی ہیں وہ کسی ایسی ذات کا کلام ہے جس کے سامنے ماضی، حال اور مستقبل سب کے حالات و واقعات یکساں طور سے عیاں ہیں، جو تاریک رات میں بھی اپنے بندوں کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتا ہے۔

(۳) قرآن کے کلامِ خداوندی ہونے پر وہ سائنسی حقائق بھی شاہد ہیں جن کی قرآن نے آج سے سیکڑوں برس پہلے نقاب کشائی کی تھی اور آج سائنسی تحقیق و تجزیہ ان حقائق کی تصدیق کر رہا ہے جناب سید اطہر حسین سابق آئی، اے، ایس لکھنؤ اپنے مقالہ 'قرآن اور مستشرقین' میں لکھتے ہیں۔

''قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں مگر وہ بہت سے مظاہر قدرت کی نسبت اشارے یا معلومات بہم پہونچاتا ہے، جن کے متعلق انسان کو صدیوں بعد تک مطلق کوئی علم نہ تھا، چند مثالیں ملاحظہ ہوں، زمین کی گولائی اور گردش، مینہ کی تشکیل، ہوا کے ذریعہ نرو مادہ پھولوں کی تولیدی مادہ کا اتحاد، تمام اشیاء میں نرو مادہ کا وجود، چاند و سورج اور سیاروں کا مقررہ برجوں میں گردش کرنا، سورج کی ازخود روشنی اور چاند کا اس کی روشنی سے ہونا، تمام جانداروں کا آبی ماخذ، شہد کی مکھیوں کا طرزِ زندگی، بچہ کی رحم مادر میں تدریجی تشکیل، اور اس کا تین پردوں میں رہنا۔'' وغیرہ۔(۱)

مشہور مستشرق موریس بوکائیے نے اس سلسلے میں پوری ایک کتاب لکھی جس کا نام ''بائبل سائنس اور قرآن رکھا'' اس کتاب میں اس نے قرآن کریم میں پیش کردہ سائنسی حقائق کا تجزیہ کر کے ثابت کیا کہ یقیناً قرآن کے اندر بیان کئے گئے تمام سائنسی امور صد فیصد صحیح ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں اس نے توریت وانجیل کا معروضی مطالعہ کر کے ان کے اندر موجود بے شمار تضادات اور غلط بیان کا پردہ چاک کیا ہے، موریس بوکائیے اپنی تحقیق کے بعد جس نتیجہ پر پہونچا وہ یہ ہے کہ ''علوم قرآنیہ اور عصری انکشافات کے درمیان اس مقارنہ نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر قرآن وحی منزل من اللہ نہیں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کس طرح آج سے چودہ سو برس ان سائنسی حقائق کی نقاب کشائی کی جن کا انکشاف آج موجودہ دور میں ہو رہا ہے؟(۲)

(۴) قرآن کے کلام خداوندی ہونے پر خود اس کے بیان کا انداز، اظہارِ خیال کا اچھوتا اسلوب، اور خود اس کی دل نشیں عبارت کی شیرینی و چاشنی ہی سب سے بڑی دلیل ہے۔

سید اطہر حسین ریٹائرڈ آئی، اے، ایس قرآن کے اندازِ بیان اور اس کے اچھوتے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''(۱) قرآن کا انداز بیان نہ کسی مہذب شہری کی بزم نگاری ونزاکت کی مانند ہے

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۱۰۹ تا ۱۱۱: مطبع سابق۔

۲۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۱۰۹ تا ۱۱۱: مطبع سابق۔

اور نہ ایک خانہ بدوش بدوی کی درشت کلامی کے مماثل ہے، بلکہ اول الذکر کی شیریں کلامی اور ثانی الذکر کے زورِ کلام کا حسین مجموعہ ہے۔

(۲) نثر میں الفاظ کا وزن اور نغمہ اس طرح برقرار رکھا گیا ہے جیسا کہ کلام منظوم میں ہوتا ہے۔

(۳) الفاظ کا انتخاب ایسا ہے کہ نہ وہ ٹکسال سے باہر ہیں اور نہ ایسے جن سے کان آشنا نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر شوکت الفاظ کا وہ عالم ہے کہ کہیں بھی فصاحت سے تجاوز نہیں۔

(۴) جملوں کی ترکیب شاندار ہونے کے باوجود کم سے کم الفاظ میں بلند سے بلند خیالات کا اظہار ہوا ہے۔

(۵) اظہار خیال ایسے مختصر، جامع مگر سلیس الفاظ میں کیا گیا ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بغیر کسی دقت کے قرآن کا مفہوم سمجھ سکتا ہے۔

(۶) قرآن میں وہ باریک بینی، لچک اور تنوع ہے کہ وہ اسلامی علوم وفنون کے علاوہ شریعت وفقہ کی بنیاد کا کام بھی دیتا ہے۔

(۷) نفسیات کا یہ قانون ہے کہ عقل اور جذبات باہم متضاد ہوتے ہیں، مگر قرآن کی عبارت اس قانون سے بالاتر ہے، کیونکہ وہ مافوق البشر ہستی کی بنائی ہوئی ہے، قرآن میں عقل اور جذبات کی باہم متضاد قوتوں میں حیرت انگیز ارتباط پایا جاتا ہے۔"(۱)

مستشرقین ہمیں بتائیں کہ کیا کسی انسان سے اور وہ بھی ایسے انسان سے جس نے کسی ماہر نفسیات سے نفسیات کے قوانین نہ پڑھے ہوں، جو محض امی تھا؟ کیا ایسے شخص سے ایسے کلام کا صدور ممکن ہے جس کے اندر مذکورہ تمام خوبیاں موجود ہوں، جس میں کہیں کوئی تضاد نہ ہو، جس کی کوئی عبارت مقصود کی ادائیگی سے قاصر نہ ہو؟ اگر ہاں تو مستشرقین دنیا کے تمام ادبی شہ پاروں کو کھنگال کر کوئی ایسی مثال پیش کریں جس کے اندر مذکورہ تمام اوصاف موجود ہوں۔ یہ کام انشاء اللہ ان سے صبح قیامت تک نہ ہو سکے گا۔

(۵) آج پوری دنیا میں اسلام کی اشاعت جتنی سرعت کے ساتھ ہو رہی ہے وہ قابل حیرت ہے، عیسائی و یہودی مشنریاں عربوں روپئے خرچ کر رہی ہیں پھر بھی عیسائیت

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/ ۱۰۹ تا ۱۱۱؛ مطبع سابق۔

اور یہودیت اسلام کے مقابلہ میں بجائے بڑھنے کے اور سمٹتی جارہی ہیں، فطری طور سے یہاں ایک سوال پیدا ہوگا کہ ایک ایسا مذہب جس کی بنیاد کسی ایسی کتاب پر ہو جو انسانی ذہن کی پیداوار ہو وہ آخر اتنی تیزی سے کیوں گم گشتگان راہ کو اپنے دامن میں سمیٹتے جارہی ہے، جب کہ دوسری طرف یہودیت ونصرانیت ہیں، جن کی اشاعت اتنی سرعت سے نہیں ہورہی ہے جتنی سرعت سے اسلام کی نشرواشاعت ہورہی ہے، حالانکہ ان دونوں مذاہب کی بنیاد توریت وانجیل پر ہے جو کہ کلام الٰہی ہیں، کیا مستشرقین کی ایمانی حرارت اس امر کو تسلیم کرے گی کہ توریت انجیل جو کہ کلام خداوندی ہیں ان کے اندر وہ مقناطیسیت نہیں ہے جو قرآن کے اندر ہے حالانکہ قرآن ان کے زعم میں ایک امی کا کلام ہے، اگر نہیں تو پھر توریت وانجیل کی طرح قرآن کو بھی آسمانی صحیفے کا درجہ دینے میں کیا حرج ہے؟

(٦) قرآن نے نبی کریم کی ذاتی رائے اور شخصی مزاج سے کئی جگہ اختلاف کیا ہے، مثلاً ایک موقع پر نبی کریم ﷺ کو قرآن خطاب کرتے ہوئے گویا ہے:

"مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ" [انفال:٦٧]

کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کرے جب تک زمین میں یہ ان کا خون خوب خوب نہ بہائے، تم دنیا کی پونجی چاہتے ہو اور اللہ آخرت کی، اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ بدر کے قیدیوں کو نبی کریم ﷺ نے اپنی نرم خوئی کی وجہ سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جس پر اللہ رب العزت نے یہ آیت کریمہ اتاری اور آپ ﷺ کو بجائے فدیہ لے کر رہا کرنے کے قتل کرنے کا حکم دیا، اس تاکیدی بیان اور تنبیہی کلام میں مقام ربوبیت اور مقام عبدیت کا فرق بہت زیادہ نمایاں ہے، طرز کلام ایسا ہے کہ متکلم اور مخاطب دونوں کی حیثیت واضح طور پر مختلف نظر آتی ہے۔

یوں ہی غزوہ تبوک میں بعض منافقین نے جب آپ کے سامنے شرکت سے باز رہنے کا عذر پیش کیا تو آپ نے ان کو عدم شرکت کی اجازت دے دی اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

"عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ"

[توبہ:٤٣]

اللہ تمہیں معاف کرے، تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا جب تک کہ تمہارے سامنے سچوں کے حال نہ کھلے تھے اور جب تک تم جھوٹوں سے باخبر نہیں ہوئے تھے۔

انسان جب کوئی ذاتی رائے قائم کرلیتا ہے تو پھر اس سے عدول کرنے میں سبکی محسوس کرتا ہے، خاص طور سے وہ انسان جس کو معاشرہ میں قیادت کا شرف حاصل ہو اور جو ہمیشہ معتقدین سے گھرا رہتا ہو، کوئی انسان ایسا نہیں ملے گا (الا ماشاء اللہ) جسے یہ مرتبہ حاصل ہو اور وہ کوئی فیصلہ کرے پھر اپنے ہی فیصلے کے خلاف خود اپنے کلام سے اپنے کو تنبیہ کرے اور اپنے کو سرزنش کرکے اپنے حلقہ احباب میں اپنا وقار کم کرے، ایسے میں قرآن کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے اور آپ کے شخصی مزاج کے خلاف آپ کو تنبیہ کرنا اور آپ کے کئے ہوئے فیصلے سے اختلاف کرنا کیا اس امر کا بین ثبوت نہیں ہے کہ قرآن کسی ایسی ذات کا کلام ہے جس کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اپنے رسول کو تنبیہ کرے، اور ان کے ذریعہ صادر فیصلوں کے خلاف اپنا کلام نازل کرے۔

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یقیناً قرآن اللہ کا کلام ہے کسی انسانی ذہن کی پیداوار نہیں، میں اس بحث کو ایک سابق مستشرق 'ایتین ڈینیہ' کی اس بات پر ختم کررہا ہوں جسے ضیاء الدین اصلاحی نے اپنے مقالہ 'مستشرقین کے نزدیک نبوت اور وحی کے دلائل' میں پیش کیا ہے، مستشرق مذکور لکھتا ہے کہ:

''میرے لئے یہ سخت تشویش اور پریشانی کی بات ہوتی ہے کہ مستشرقین یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے غار حرا کی تنہائی اور فرصت میں اپنے مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرلیا اور اسی میں آپ کو قرآن کی تصنیف وتالیف کا خیال ہوا، کیا واقعی انہوں نے ایسا کیا؟ تو پھر کوئی اور کتاب اس سے پہلے کہاں ایسی مرتب ہوئی؟ خود اس کی ہر سورت دوسری سورت سے الگ ہے، اور اس کی سورتیں آپ کو نبوت ملنے کے بعد کس خاص واقعہ کے سلسلہ میں بیس برس سے زیادہ طویل مدت میں نازل ہوئی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان واقعات کا پہلے سے متوقع رہنا اور ان کا مشاہدہ کرلینا کیسے ممکن تھا؟ درحقیقت قرآن مجید ایک اعجاز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشا گیا۔'' (۱)

---

۱ مستشرقین کے نزدیک نبوت اور وحی کے دلائل، مشمولہ اسلام اور مستشرقین: ۷/ ۲۷۔

چلتے چلتے ڈاکٹر موراد یشیا کا یہ اقتباس بھی پڑھ لیں جس میں پوری بحث کا خلاصہ موجود ہے، انہوں نے لکھا ہے:

''اسلام کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے جو تواتر و تسلسل کے ساتھ نقل ہوتا چلا آرہا ہے اور اس کے واقعات پورے یقین و وثوق کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، اس برحق کتاب کی نقل و محاکات کی کوئی گنجائش نہیں، اس کی تمام باتیں بلاغت کے یکساں معیار پر ہوتی ہیں اور وہ ایک موضوع کو چھوڑ کر دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، مگر اس کا زور بیان برقرار رہتا ہے، ہم کو اس کے اندر گہرائی کے ساتھ شیرینی بھی ملتی ہے، یہ دونوں خوبیاں ایک ساتھ جمع نہیں ہوتیں، ایسی معجزانہ کتاب کو آنحضرت کی اختراع قرار دینا بعید از عقل ہے، کیوں کہ آپ ایک عرب امی تھے۔'' (۱)

اختلاف قراءت پر مستشرقین کے اعتراضات

یہودیوں اور نصرانیوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالی نے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر توریت وانجیل جیسی مقدس ومحترم کتابیں نازل فرمائیں، آسمانی صحیفہ ہونے کے ناتے یہ دونوں کتابیں کسی بھی قسم کی کجی اور تضاد بیانی سے یکسر پاک تھیں۔لیکن حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے بعد ان کے متبعین نے ان دونوں کتابوں میں اس قدر تحریفیں کیں کی ان کے اندر موجود اصل پیغام الٰہی اور وحی ربانی کی شناخت مشکل ہوگئی، چونکہ یہ تحریفیں انسانی عقل کے ذریعہ تھیں اس لئے ان کتابوں میں اختلاف وتضاد کا پیدا ہونا فطری امر تھا،نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں تاریخی بیانات اور اعداد وشمار میں اختلافات وتضادات کی بہتات ہوگئی، اہل استشراق پر اکابر یہود ونصاریٰ کا یہ بھیانک جرم مخفی نہیں تھا،لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اب ان کتابوں میں اصلاح وتبدیلی کرکے ان کے اختلافات وتضادات کو دور کرنا پوری یہودیت ونصرانیت سے اعلان جنگ کے مترادف تھا، ساتھ ہی ساتھ یہ عمل یہود ونصاریٰ کے ان غلط عقائد ونظریات کے خلاف ایک چیلنج بھی تھا جو ان کے درمیان رائج ہو چکے تھے

۱۔ اسلام اور عربی ثقافت، بحوالہ اسلام اور مستشرقین: ۷/ ۲۰؛ مطبع سابق۔

اور جن پر ان کی عظمت وشوکت کا تاج محل ایستادہ تھا۔

ایک طرف توریت وانجیل کی یہ قابل تشویش صورتحال تھی تو دوسری طرف قرآن عظیم تھا جس کے اندر نہ تو کوئی کجی تھی نہ ہی کوئی تضاد واختلاف، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ استشراق کے لبادے میں ملبوس یہود ونصاریٰ کے یہ وکیل توریت وانجیل کے مقابلے میں قرآن کی صداقت وحقانیت کو سلام کر کے اسلام قبول کر لیتے۔ لیکن ایسا نہ کر کے انہوں نے الٹے قرآن میں اختلاف وتضاد ڈھونڈھنا شروع کر دیا، اس کے لئے انہوں نے مختلف حربے استعمال کئے، ان مختلف حربوں میں سے ایک حربہ قرآن کریم کی مختلف قراءتوں کو غلط رنگ میں پیش کرنا ہے، علامہ پیر کرم شاہ ازہری فرماتے ہیں۔

"عہدنامہ عتیق اور عہدنامہ جدید کی کتابیں تضادات سے پُر ہیں، ان کے مختلف فرقوں کے نزدیک بائبل کی تعداد میں بھی اختلاف ہے، تاریخی بیانات اور اعداد وشمار کے اختلافات جابجا نظر آتے ہیں، مستشرقین قرآن حکیم میں بھی اسی صورتحال کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں کہ جس طرح بائبل کے مختلف Versions ہیں اسی طرح یہ قراءتیں بھی قرآن حکیم کے مختلف ورزن ہیں۔" (۱)

حالانکہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو عہدنامہ قدیم اور عہدنامہ جدید سے قرآن حکیم کے اختلاف قراءت کو کوئی مناسبت ہی نہیں، بائبل کے اختلاف نے ملت عیسوی کو کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے اور قرآن حکیم کی مختلف قراءتوں نے ہر قسم کے حالات میں مسلمانوں کے لئے فکر کی نئی راہیں کھولیں ہیں، ملت کے ائمہ نے اختلاف قراءت سے مختلف احکام اخذ کئے گئے ہیں، بعض قراءتیں دوسری قراءتوں کا بیان اور تفصیل ثابت ہوئی ہیں۔ (۲)

بعض قراءتیں دوسری قراءتوں کا بیان اور تفصیل ہیں، اس نظریئے کی تائید ابوحیان اندلسی کے اس قول سے ہوتی ہے جو انہوں نے اپنی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت "فالصوالح قوانت حوافظ للغیب بما حفظ اللہ فاصلحوا إلیھن" کے سلسلے میں کہی ہے۔ آپ کا قول یہ ہے کہ:

۱۔ضیاء النبی:۶/ ۴۵۵؛مطبع سابق۔

۲۔ضیاء النبی:۶/ ۴۶۴؛مطبع سابق۔

"ينبغي حملها على التفسير لأنها مخالفة لسواد الإمام وفيها زيادة وقد صح عنه بالنقل الذي لاشك فيه انه قرأوا قرأ على رسوم السواد فلذالك ينبغي أن تحمل هذه القراءة على التفسير۔ (۱)

یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت کو جو کہ جمہور کی قراءت کے خلاف ہے اور اس میں زیادتی بھی ہے، مناسب یہ ہے کہ اس کو جمہور کی قراءت کی تفسیر اور بیان پر محمول کیا جائے، کیوں کہ آپ سے نقل صحیح کے ساتھ مروی ہے کہ آپ نے اس آیت کو جمہور ہی کی قراءت پر پڑھا اور پڑھایا ہے، اسی لئے اس قراءت کو تفسیر پر محمول کرنا مناسب ہے۔

ابوحیان کے مذکورہ بالا قول سے معلوم ہوا کہ جہاں جہاں قراءتوں میں اختلاف ہے وہاں مقصود دوسری قراءتوں کی تفسیر و توضیح ہے، قراءتوں میں اختلاف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان میں معنوی تضاد پایا جاتا ہے، چنانچہ علامہ ابن الجزری فرماتے ہیں:

''کہ اس اختلاف (قراءت) کی صرف تین ہی قسمیں ہیں۔(۱) لفظ مختلف ہوں لیکن ان کے معنی ایک ہوں۔(۲) لفظ مختلف ہوں، ان کے معنی بھی جدا جدا ہوں، لیکن ایک چیز میں دونوں معنی پائے جاسکیں، (۳) لفظ و معنی دونوں جدا جدا ہوں، اور اس طرح کہ کسی ایک چیز میں دونوں معنی کا وجود ممکن نہ ہو، لیکن کوئی دوسری صورت ایسی ہو جس سے دونوں معنوں میں تضاد باقی نہ رہے۔(۲)

مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کسی بھی صورت میں معنوی تضاد کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، ثابت ہوا کہ قرآن میں موجود اختلاف قراءت کی حیثیت کچھ اور ہے جب کہ توریت و انجیل میں موجود اختلافات کی نوعیت کچھ اور ہے، قرآنی قراءتوں کا اختلاف کسی معنوی تضاد سے کوسوں دور ہے، جب کہ توریت و انجیل کے Versions کا اختلاف معنوی اختلاف و تضاد کو مستلزم ہے۔

قراءتوں کے اختلاف کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اس اختلاف کے ذریعہ بعض قراءتوں کا بیان اور ان کی وضاحت ہوتی تھی، دوسری اہم وجہ یہ تھی مختلف عرب قبائل مثلاً مضر، فزار،

۱۔ تفسیر البحر المحیط: ۳/ ۴۰۳: مطبوعہ دار الفکر، بیروت۔

۲۔ اسلام اور مستشرقین: ۶/ ۳۵۔

اور ہذیل اپنے لب ولہجہ اور بعض لفظوں کے تلفظ میں ایک دوسرے سے مختلف تھے، اس لئے دعوت اسلامی کی ضرورتوں کی وجہ سے وقتی رخصت کے طور پر ان کو اپنے لب ولہجہ اور تلفظ میں تلاوت قرآن مجید کی اجازت دے دی گئی تھی، تاکہ آہستہ آہستہ وہ قریش کی زبان کے عادی ہو جائیں، قریش ہی کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ انہیں کے لہجے اور تلفظ کو اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے، تاکہ ایک ہی تلفظ کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کی جا سکے، اس کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے نسخہ کی کتابت کروائی۔(۱)

لیکن خیال رہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے پوری امت کو ایک ہی لغت پر جمع کر دیا تھا، پھر اس لغت کے اندر یہ خوبی ضرور تھی کہ اس میں تمام متواتر قراءتوں کے اجرا کا احتمال باقی رکھا گیا تھا، چنانچہ زکریا ہاشم زکریا لکھتے ہیں:

"ولقد كانت للقرآن لهجات عربية نسخت كلها بعد تمام نزول القرآن ...واللغة الواحدة تحمتل قراءات القرآن المتواترة كلها۔ (۲)

قرآن کریم کے کئی عربی لہجے تھے، جو نزول قرآن کی تکمیل کے ساتھ منسوخ کر دیئے گئے، اور ایک ہی لغت قرآن کی تمام متواتر قراءتوں کا احتمال رکھتی ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اختلاف قراءت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے ذریعہ بعض قراءتوں کا بیان مقصود تھا اور دوسری وجہ عرب کے مختلف قبائل کے لئے قرآن کی تلاوت میں سہولت پیدا کرنا مقصود تھا، اختلاف قراءت کا مقصد لفظ کے معنی ومفہوم کی تعیین نہیں تھی، جیسا کہ گولڈزیہر نے کہا ہے کہ آیت کریمہ:

"إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا"

[فتح:۸،۹]

میں لفظ 'توزروہ' کو 'توززوہ' بھی پڑھا گیا ہے، میرے نزدیک ['گولڈزیہر' کے خیال میں] اس تبدیلی کی ایک وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ آیت قرآنیہ سے یہ مفہوم نہ اخذ کر لیا

۱۔ قرآن کریم اور مستشرقین، بحوالہ اسلام اور مستشرقین: ۶/ ۴۳؛ مطبع سابق۔

۲۔ المستشرقون والاسلام، ص: ۶۔

جائے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں سے مدد یا تعاون کا طلب گار ہے۔(۱)

گولڈزیہر کے مذکورہ بالا قول سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس کے خیال میں 'توزروہ' کو بعض لوگوں نے 'توززوہ' اس لئے پڑھا ہے، تا کہ اس لفظ کے ذریعہ لوگ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں اور لفظ کا معنیٰ متعین ہو جائے، جب کہ گولڈزیہر کا مذکورہ بالا استدلال دو وجھوں سے غلط ہے، ایک تو یہ کہ جس قراءت کو انہوں نے محل استشہاد بنایا ہے اس کا شمار نہ سات قراءت متواترہ میں ہوتا ہے نہ ہی ان چودہ قراءتوں میں اس کا شمار کیا جاسکتا ہے، جو دیگر قسموں کو شامل کر کے زیادہ سے زیادہ شمار کی جاسکتی ہیں، اس لئے علمی استدلال کے لئے اس پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہوگا، دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر مفسرین نے 'توزروہ' کی تفسیر کی ہے، کہ تم اللہ کی مدد کرو اس کے دین اور رسول کی حمایت کر کے، قرآن میں اللہ کی مدد سے یہی معنی مراد لیا گیا ہے چنانچہ قرآن میں ایک جگہ:

"يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ"

[محمد:۷]

ہے، اس میں اللہ کی نصرت کا وہی معنیٰ ہے جو ہم نے بیان کئے ہیں، ایسے میں توزروہ کی قراءت سے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے مدد یا تعاون کا طلب گار ہے، کہ اس احتمال اور تصور کے انسداد کے لئے 'توززوہ' کی قراءت کی ضرورت پڑے۔

یوں ہی گولڈزیہر نے اختلاف قراءت کی ایک وجہ اور بتلائی ہے کہ قرآن کی کچھ آیتوں میں ایک قراءت اپنانے سے اللہ یا اس کے رسول کی شان میں گستاخی یا فساد معنیٰ کا احتمال ہے، اس لئے وہاں دوسری قراءت کے ذریعے اس احتمال کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، چنانچہ ایک آیت کریمہ کا ایک جز ہے:

"وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ"

[آل عمران:۱۶۱]

قراء سبعہ میں سے ابن کثیر، ابوعمر اور عاصم نے یَغُلّ کی روایت کی ہے اور باقی

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۶/۴۸، مطبع سابق۔

چار ائمہ قراءت سے یُغَل مروی ہے، پہلی قراءت کے لحاظ سے مفہوم یہ ہوگا کہ نبی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے ہی کچھ لے لیں، دوسری قراءت کے مطابق مفہوم یہ ہوگا کہ کسی نبی کی سیرت ایسی نہیں ہوتی کہ اس پر اس کی امت خیانت کا کوئی الزام عائد کرے، بہرحال نتیجہ کے اعتبار سے اور مفہوم ومعنی کے لحاظ سے دونوں قراءتوں میں کوئی اختلاف نہیں لیکن گولڈزیہر کہتا ہے کہ:

''کسی مسلمان کو یہ بات نامناسب معلوم ہوئی ہوگی کہ نبی کی طرف کسی ناپسندیدہ کام کے لئے بطور مفروضہ ہی سہی کوئی امکان برقرار رہے، خواہ اس میں تردیدی پہلو ہی اختیار کیا گیا ہو، چنانچہ زیادہ تر لوگوں نے فعل مجہول ہی پڑھ کر متوقع شبہ کا ازالہ کر دیا، اب اس ناپسندیدہ مفروضہ کی نفی ہوگئی کہ نبی کسی نادرست فعل کا مرتکب ہوسکتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر الذہبی نے گولڈزیہر کے مذکورہ نظریے کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''گولڈزیہر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے قرآن مجید کے مذکورہ لفظ کو فعل مجہول میں اس لئے تبدیلی کر دیا تاکہ رسول اللہ ﷺ پر سے خیانت کے الزام کو دور کیا جاسکے، لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ قرآن مجید کے کسی لفظ میں اگر رسول اللہ ﷺ نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے تو پھر عام لوگ اس میں ترمیم کی جرأت کیسے کرلیتے؟ آیت بالا کا باقی حصہ ہے:

''وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ''

[آل عمران:۱۶۱]

اس حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے یغل کو معروف ہی باقی رکھا ہے، تو جب خود نبی ﷺ نے فعل مجہول نہیں پڑھا ہے تو پھر عام لوگ اس کو فعل مجہول پڑھنے کی جرأت کیسے کرسکتے ہیں؟

پھر یہ نکتہ بھی مستشرق مذکور کی نظر سے اوجھل نہیں ہوگا کہ بہت ساری آیتوں میں نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے تاکید وتنبیہ فرمائی ہے، اگر اختلاف قراءت اور ترمیم کا داعیہ وہی ہوتا جو گولڈزیہر نے بیان کیا ہے تو کیا مسلمان ان آیتوں میں ترمیم نہیں کرتے جن سے

۱۔ مذاہب التفسیر الاسلامی: ص: ۴۰۔

اللہ نے اپنے نبی پر عتاب کیا ہے؟

جیسا کہ میں اس سے پہلے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ قرآن میں اختلاف قراءت سے کوئی معنوی تضاد لازم نہیں آتا ہے، بلکہ اس سے تحقیق وتفحص کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور یہ امت محمدیہ پر رب کی رحمت اور اس کا انعام ہے کہ اس نے اپنے کلام مجید کی تلاوت میں مختلف اللسان قبیلوں اور طبقوں کا لحاظ فرما کر قرآن کو سات قراءتوں کے ساتھ پڑھنے کی چھوٹ دی ہے، آیئے ذیل میں ہم کچھ مثالوں کے ساتھ اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ قرآن میں موجود اختلاف قراءت کا اس تناقض واختلاف سے دور کا بھی واسطہ نہیں جو عہد نامہ قدیم وجدید میں ہے، پہلے اختلاف قراءت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) "یَاۤ اَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِیۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَہَالَۃٍ"۔ [حجرات:۶]

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لو کہ کہیں کسی قوم کو بیجا ایذا نہ دے۔

اس آیت کریمہ کے لفظ 'فتبینوا' کو حضرت حفص کے علاوہ دوسرے حضرات نے 'فتثبتوا' پڑھا ہے۔ 'فتبینوا' کا معنی تحقیق کرنا، اور معاملہ کی چھان بین کرنا ہے اور 'فتثبتوا' کا معنی بھی اس کے بالکل قریب ہے، لغت کی مشہور کتاب المنجد میں 'تثبت' کے معنی لکھا ہے "تثبت فی الأمر والرأی تأنی فیه، شاور فیه وفحص عنه" یعنی کسی معاملہ میں جلد بازی نہ کرنا، کسی رائے کے بارے میں مشورہ کرنا اور اس کی خوب تحقیق کرنا۔

(۲) "وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبۡحٰنَہٗ" [بقرہ:۱۱۶]

ابن عامر نے اس کو بغیر واؤ کے "قالوا اتخذ الله الخ" پڑھا ہے، لیکن جمہور نے اتخذوا" واؤ کے ساتھ پڑھا ہے، دونوں قراءتوں میں فاعل واحد جمع ہونے کے لحاظ سے ضرور بدلا لیکن معنوی طور سے دونوں قراءتوں میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

(۳) "وَلِتُکۡمِلُوا الۡعِدَّۃَ" [بقرہ:۱۸۵]

اس لفظ کو جمہور قراء نے میم کی تشدید کے بغیر جزم کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ ابوبکر اور یعقوب نے اس لفظ کو میم کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، دونوں جگہ مادہ ایک ہے،

صرف ابواب کا اختلاف ہے، اور اس مادہ کے باب افعال اور باب تفعیل کا معنی علمائے لغت کے نزدیک ایک ہی ہے۔

(۴) قَالُوا مَآ اَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَكَ بِمَلۡكِنَا۔ [طٰہٰ:۸۷]

اس میں لفظ 'بملکنا' کو میم کے فتحہ کے ساتھ مدنی اور عاصم نے پڑھا ہے، اور اس کے ضمہ کے ساتھ حمزہ اور علی نے پڑھا ہے اور میم کے کسرہ کے ساتھ ان دونوں کے علاوہ باقی قاریوں نے پڑھا ہے، لغت میں تینوں قراءتوں کے معانی میں کوئی زیادہ تفاوت نہیں ہے۔

قارئین کرام نے قرآن میں موجود اختلاف قراءت کے ساتھ توریت وانجیل میں موجود تناقض واختلاف کی نوعیت کو ملاحظہ فرمالیا، قرآن کی قراءتوں کے اختلاف اور اس اختلاف میں کیا واسطہ ہے جو عہدنامہ قدیم وجدید میں موجود ہے؟ توریت وانجیل کے مختلف ایڈیشنوں میں جس قسم کے اختلاف ہیں اگر اختلاف قراءت کا مطلب مستشرقین کی نظر میں وہی ہے تو بفضل الٰہی قرآن کا دامن اس قسم کے اختلاف وتناقض کے دھبے سے بالکل پاک ہے۔

قرآن کی ناسخ ومنسوخ آیتوں پر اعتراضات

قرآن کریم کی عظمت شان اور اس کے وقار کو کم کرنے کی خاطر مستشرقین نے جو اعتراضات کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم کا دامن تضاد وتناقض سے پاک نہیں ہے، چنانچہ قرآن میں کئی آیات ایسی ہیں جو باہم متضاد ومتناقض ہیں، لیکن مسلمان اور امت محمدیہ کے علما اس تناقض سے یہ کہہ کر ہاتھ جھاڑ لیتے ہیں کہ قرآن میں تضاد کا کہیں وجود نہیں، جن آیات میں بظاہر تضاد ہے، وہ درحقیقت متضاد نہیں ہیں بلکہ ان کا آپس میں تعلق ناسخ ومنسوخ کا ہے، گویا مستشرقین کی نظر میں مسلمانوں نے قرآن میں ناسخ ومنسوخ کا نظریہ اس لئے گڑھا ہے تاکہ اس کے ذریعہ قرآن میں موجود تناقض کو لے کر اٹھنے والے اعتراضات سے بچ جائیں، چنانچہ جارج سیل اپنے ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں کہتا ہے۔

''قرآن میں کچھ آیات ایسی ہیں جو باہم متضاد ہیں، مسلمان علما نسخ کے اصول کے ذریعہ ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا دفاع کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے

قرآن حکیم میں کچھ احکام صادر فرمائے، جن کو بعد میں معقول وجوہات کی بنا پر منسوخ کر دیا گیا۔"(۱)

منٹگمری واٹ اپنی کتاب 'محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس' میں لکھتا ہے:

"محمد ﷺ کا یہ عقیدہ کہ ان کے پاس وحی خدا کی طرف سے آتی ہے، ان کو مواد کو ترتیب نو دینے اور بالالفاظ دیگر حذف واضافے کے ذریعہ اس میں ترمیم کرنے سے باز نہیں رکھتا تھا، قرآن میں کچھ حوالے ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ خدا محمد ﷺ کو کچھ آیات بھلوا دیتا تھا، متن کے بغور مطالعہ سے یہ بات تقریباً یقینی ہو جاتی ہے کہ قرآن کے کچھ الفاظ اور آیات کا بعد میں اضافہ کیا گیا ہے، البتہ اس قسم کے اضافوں کا محمد ﷺ کے پاس کوئی ذریعہ ایسا موجود تھا کہ جب ان کو قرآن کے کسی حصے میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو وہ وحی کے الفاظ سن لیتے تھے، لیکن وہ وحی کے بغیر ترمیم نہیں کرتے تھے، روایت پسند مسلمانوں کے لئے کچھ قوانین بیان ہوئے تھے وہ بعد کی آیات کے ذریعہ منسوخ ہو گئے۔"(۲)

منٹگمری واٹ درحقیقت یہ کہنا چاہتا ہے کہ قرآن کے کچھ حصے خود حضور ﷺ کی تصنیف ہیں، مشترق مذکور کا یہ نظریہ سراسر غلط ہے، کیوں کہ اگر موصوف کی مذکورہ بات کو صحیح مان لیا جائے تو پھر قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے عقیدے کی ضرورت ہی کیا ہے، جو قرآن میں ترمیم کرسکتا ہے وہ قرآن کی تصنیف بھی کر سکتا ہے، گویا مستشرقین نسخ کو حضور کی طرف سے قرآن پر نظر ثانی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ حضور ﷺ پر صریح بہتان ہے، آیئے ہم ذیل میں پہلے نسخ کے معانی اور اس کے شرائط وغیرہ سے بحث کرتے ہیں پھر ہم آگے چل کر دکھائیں گے کہ عہد نامہ قدیم وجدید کی کتابیں بھی نسخ سے خالی نہیں ہیں، اگر قرآن میں نسخ اپنانے کی وجہ تناقض واختلاف کو دور کرنا ہے، تو پھر توریت وانجیل کے بارے میں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں بھی نسخ اپنانے کی وجہ ان کے اندر موجود تناقض واختلاف کا ازالہ ہے۔

۱۔ دی قرآن، جارج سیل، ص: ۵۲۔

۲۔ محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس مین، ص: ۱۸، ۱۷؛ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس: ۱۹۷۱ء۔

✿ نسخ کا مفہوم

علامہ ابن شاہین فرماتے ہیں:

"یطلق النسخ علی عدۃ معان (۱) بمعنی الرفع والازالۃ، والازالۃ نوعان، إزالۃ إلی بدل، کنسخت الشمس الظل، وازالۃ إلی غیر بدل، کنسخت الریح اثر القوم (۲) بمعنی النقل والتحویل ومنہ قولہ تعالیٰ "إنا کنا ننسخ ما کنتم تعملون"

نسخ کا اطلاق چند معانی پر ہوتا ہے۔(۱) رفع اور ازالہ۔ ازالہ دو طرح کا ہوتا ہے،(۱) ایک چیز کو ہٹا کر دوسری چیز کو اس کی جگہ رکھنا، جیسے کہ دھوپ نے سایئے کو منسوخ کردیا، اور ازالہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ ایک چیز کو ہٹا تو دیا جائے، مگر اس کی جگہ پر دوسری چیز نہ رکھی جائے۔

(۲) نسخ کا دوسرا معنی نقل اور پھیرنا ہے، اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا قول "إِنَّا كُنَّا نَنسِخُ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ" ہے۔

یہ تو نسخ کا لغوی مفہوم ہے، اصطلاح میں نسخ کی تعریف یہ ہے:

"ھو بیان انتھاء حکم شرعی بطریق شرعی متراخ عنہ"

کسی حکم شرعی کی انتہائے وقت کو بیان کرنا اس کے بعد کے کسی دوسرے شرعی طریقے سے۔

ایک دوسری تعریف یہ ہے:

"رفع حکم شرعی بدلیل متراخ عنہ"(۱)

کسی حکم شرعی کو اس کے بعد کی دلیل شرعی سے اٹھا دینا۔

نسخ کے جواز پر تمام امت کا اتفاق رہا ہے، ارباب شریعت میں سے صرف "شمعونیہ" نامی ایک یہودی گروہ نے نسخ کا انکار کیا ہے۔

۱۔ الناسخ والمنسوخ للعلامۃ ابن شاہین، ص: ۴، ۵، مطبوعہ مرکز اہلسنت برکات رضا پوربندر، گجرات۔

✿ محلِ نسخ

علامہ ابن شاہین محلِ نسخ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"هو الحكم الشرعي الذي لم يلحقه تأبيد ولا تأقيت"(۱)

یعنی محلِ نسخ وہ حکمِ شرعی ہے جس کے ساتھ نہ تو دوام کی قید ہو اور نہ ہی وہ موقت ہو۔

لہٰذا احکامِ عقلیہ واعتقادیہ محلِ نسخ نہیں ہیں، جیسے اللہ کی وحدانیت اور ایمان کا وجوب، یوں ہی احکامِ حسیہ محلِ نسخ نہیں ہیں، جیسے آگ کا جلانا، اسی طرح وہ احکام جو نص یا دلالۃ النص کے ذریعہ مؤبد اور دوائی ہوں وہ بھی محلِ نسخ نہیں ہیں، جیسے ارشادِ باری تعالیٰ:

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوٓا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

اس میں "إلى يوم القيامة" کے ذریعہ حکم کو مؤبد کر دیا گیا ہے، لہٰذا اس میں نسخ کا احتمال باقی نہیں رہ گیا، اسی طرح وہ احکام جن کو کسی وقت سے موقت کر دیا گیا ہو وہ بھی وقت پورا ہونے سے قبل محلِ نسخ نہیں ہو سکتے، مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ:

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ

اس میں بھی کھانے پینے کے حکم کو ایک معین وقت سے موقت کر دیا گیا ہے، لہٰذا اس میں بھی اس معین وقت سے پہلے حکم منسوخ نہیں ہوگا، یوں ہی ماضی یا مستقبل سے متعلق خبریں بھی محلِ نسخ نہیں ہیں۔

✿ نسخ کا زمانہ

علامہ موصوف فرماتے ہیں:

"النسخ للأحكام المنصوصة لا يكون إلا في حياة الرسول عليه السلام، لأن هذه الأحكام بعد وفاته تصير مؤبدة بانقطاع الوحي فلا تكون محلاً للنسخ۔"(۲)

احکامِ منصوصہ میں نسخ کا وقوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ظاہری ہی میں ممکن ہے،

۱۔ الناسخ والمنسوخ للعلامۃ ابن شاہین ص: ۱۵، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکاتِ رضا، پوربندر، گجرات۔

۲۔ الناسخ والمنسوخ، ص: ۱۶، مطبع سابق۔

کیوں کہ آپ کی وفات کے بعد وحی کے انقطاع کے ناتے یہ احکام مؤبد ہو جاتے ہیں، اس لئے اب یہ احکام محل نسخ نہیں ہو سکتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول گرامی وقار کی ظاہری حیات کے بعد نسخ کا دروازہ ہمیشہ ہمیش کے لئے بند ہو گیا، کیونکہ نسخ کے دو ہی راستے تھے یا تو وحی الٰہی یا سنت رسول ﷺ، آپ کے بعد دونوں راستے بند ہو گئے، اور شریعت تام ہو چکی، احکام میں استقرار آ گیا، اب اس کے بعد ان احکام میں نہ تو کسی نسخ کی گنجائش ہے، نہ ہی تغیر و تبدل کی۔

❁ شرائط نسخ

نسخ کے شرائط دو طرح کے ہیں، ایک متفق علیہ، دوسرے مختلف فیہ، اولاً ہم متفق علیہ شرطوں کو بیان کرتے ہیں۔

(۱) ناسخ منسوخ سے متراخی ہو، لہٰذا اس حکم میں نسخ نہیں ہوگا جو ناسخ سے متصل ہو۔

(۲) منسوخ حکم شرعی ہو، جس میں امکان کا پہلو موجود ہو، ایسا حکم شرعی جو واجب لذاتہ ہو، جیسے اللہ پر ایمان لانے کا حکم، یا ممتنع لذاتہ ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا کفر ایسے حکم شرعی میں نسخ نہیں ہوگا۔

(۳) دلیل نسخ شرعی ہو، لہٰذا اس قید سے موت یا جنون یا اور دوسرے معقول عذر نکل جائیں گے۔

کیوں کہ یہ شخص مکلف سے حکم شرعی اٹھاتے تو ہیں مگر دلیل شرعی نہ ہونے کے ناتے اس کو نسخ نہیں کہا جائے گا، کیونکہ یہاں رفع حکم دلیل شرعی سے نہیں بلکہ عقل کے اس فیصلے سے ہوا ہے کہ موت یا جنون کے ساتھ شخص مکلف سے تکلیف اٹھ جاتی ہے۔(۱)

وہ شرائط جو مختلف فیہ ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ناسخ منسوخ سے خفیف ہو۔

(۲) منسوخ کی جگہ لینے والی کوئی شئ وہاں موجود ہو۔

۱۔ الناسخ والمنسوخ: ص: ۱۸؛ مطبع سابق۔

(۳) دلیل ناسخ اور منسوخ کی جنس ایک ہی ہو۔(۱)

٭ نسخ کا حکم

"وجوب العمل بالناسخ وترك الحكم المنسوخ فقط" (۲)
ناسخ پر عمل کرنا اور حکم منسوخ کو ترک کرنا۔

٭ قرآن میں نسخ کی صورتیں

قرآن میں چند طرح سے نسخ کا وقوع ہوا ہے۔
(۱) تلاوت اور حکم دونوں کا نسخ۔
(۲) صرف حکم کا نسخ۔
(۳) صرف تلاوت کا نسخ۔
(۴) نسخ کلی (۵) نسخ جزئی۔(۳)

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ 'نسخ کوئی قانونی چھڑی نہیں جو جس عقیدے کو چاہے باطل کردے، جس تاریخ وبیان کو چاہے بدل دے، جس قانون کو چاہے کالعدم قرار دے دے، اور جس اخلاقی ضابطے کو چاہے ملیا میٹ کردے، نہ اس کے لئے زمانے کی پابندی ہو، نہ مسئلے کی نوعیت اس قانون پر اثر انداز ہوتی ہو۔(۴)

بلکہ نسخ کا مطلب صرف اور صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یا اس کے رسولوں کی طرف سے وقت کے تقاضے پر کوئی حکم شرعی لاگو کیا گیا، پھر اس حکم شرعی کی ضرورت نہ رہنے پر اس کو ہٹا کر دوسرا حکم اسی کی جگہ پر لگا دیا گیا، مجھے بتایا جائے کہ اس میں کون سی ایسی بات ہے جو تضاد یا اختلاف کی طرف منجر ہو، بلکہ یہ تو عین مصلحت اور دوامی وسرمدی دین کی پہچان ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت نہ رہی تو اس کو باقی رکھنے کے کیا معنیٰ؟ مصلحت تو یہ ہے کہ اس کو

۱۔ الناسخ والمنسوخ: ص: ۱۸؛ مطبع سابق۔

۲۔ الناسخ والمنسوخ: ص: ۱۹؛ مطبع سابق۔

۳۔ الناسخ والمنسوخ: ص: ۲۲؛ مطبع سابق۔

۴۔ ضیاء النبی: ۶/ ۲۱۶؛ مطبع سابق۔

اٹھا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا حکم لگایا جائے، تا کہ لوگ اس نئے حکم سے متمتع ہوں، ان کے اندر ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا ہو، اور اس طرح وہ نئی اسپرٹ کے ساتھ اس حکم پر عمل پیرا ہو۔

مستشرقین اس اصول سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ دو چیزوں کے درمیان تناقض واختلاف کے لئے کچھ شرائط ہیں، جن میں سے وحدت زمان یعنی دونوں کے زمانے کا ایک ہونا بھی شرط ہے، مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ناسخ ومنسوخ کا زمانہ ایک نہیں ہوتا ہے بلکہ دونوں کا زمانہ آگے پیچھے ہوتا ہے، پھر دونوں میں تناقض کہاں رہا ہے؟ ہاں اگر ایک ہی زمانے میں کسی کام کا حکم دیا جاتا پھر اسی زمانے میں اس کام سے روکا جاتا تب دونوں میں تناقض ہوتا، تو جب ناسخ ومنسوخ میں تناقض نہیں، تو اب مستشرقین کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ نسخ کا اصول مسلمانوں نے اس لئے اپنایا ہے تا کہ باہم متضاد آیتوں کے تناقض کو دور کیا جاسکے؟ جب تناقض ہے ہی نہیں تو ازالہ تناقض کے کیا معنیٰ؟

❁ سابقہ شریعتوں میں نسخ کی مثالیں

نسخ کوئی ایسی چیز نہیں جو مسلمانوں کی ایجاد ہو، بلکہ یہ سابقہ شریعتوں میں بھی موجود ہے، توریت وانجیل کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سابقہ شریعتوں میں نسخ کی دو صورتیں رائج تھیں، ایک یہ کہ شریعت اپنے سے پہلے والی شریعت کو منسوخ کرتی، دوسرے یہ کہ ایک ہی شریعت کے احکام اسی شریعت کے سابقہ احکام کو منسوخ کریں، اول الذکر کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) شریعت موسویہ میں بہنوں سے نکاح مطلقاً حرام ہے، خواہ وہ بہن صرف ماں کی طرف سے ہو، یا باپ کی طرف سے، یا دونوں طرف سے، چنانچہ کتاب استثناء کے باب نمبر: ۲۷ کی آیت نمبر: ۲۲ کے الفاظ یہ ہیں۔

”وہ شخص لعنتی ہے جو اپنی بہن سے ہمبستری کرتا ہے، خواہ وہ اس کے باپ کی بیٹی ہو، خواہ اس کی ماں کی بیٹی ہو۔“

لیکن بائبل کے خود اپنے بیان کے مطابق بہن سے نکاح کرنا جائز تھا، چنانچہ حضرت سارہ جو حضرت ابراہیم کی زوجہ ہیں، وہ آپ کی باپ کی طرف سے بہن تھیں، چنانچہ کتاب پیدائش کے باب نمبر: ۲۰ کی آیت نمبر: ۱۲ میں حضرت ابراہیم کے یہ الفاظ آج بھی

موجود ہیں۔

''علاوہ ازیں وہ میری بہن ہے، وہ صرف میرے باپ کی بیٹی ہے اور میری ماں کی بیٹی نہیں ہے، اور میری بیوی بن گئی ہے۔''

اگر یہاں ناسخ ومنسوخ کے تصور کو تسلیم نہ کیا جائے تو تمام اولاد آدم اور خود حضرت ابراہیم تک جملہ انبیائے کرام اس فتویٰ کی زد سے نہیں بچ سکتے ہیں، جو شریعت موسویہ نے بہن سے شادی کرنے والوں پر لگایا ہے۔(۱)

(۲) بائبل کے بیان کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں تمام سبزیوں اور جانوروں کا کھانا حلال تھا، چنانچہ کتاب پیدائش کے باب نمبر:۹ کی آیت نمبر:۳ میں حضرت نوح علیہ السلام سے کہا جارہا ہے:

''سبزیوں کی طرح تمام حرکت کرنے والے جانور جو زندہ ہیں وہ تمہاری خوراک بن سکتے ہیں۔''

لیکن شریعت موسویہ میں اکثر جانوروں کو حرام قرار دے دیا گیا، چنانچہ کتاب الاحبار کے باب نمبر:۱۱ میں ان جانوروں کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار کے لئے حرام ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں سب جانور حلال تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں کئی جانوروں کی حرمت کا اعلان کردیا گیا، یہ نسخ نہیں تو اور کیا ہے؟

(۳) کتاب پیدائش کے باب نمبر:۲۹ میں وضاحت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے ماموں کی دو بیٹیوں 'لیا' اور 'راحیل' کو ایک ساتھ نکاح میں رکھا، لیکن شریعت موسویہ میں ایک ساتھ دو بہنوں کو نکاح میں رکھنا حرام ہے، کتاب الاحبار کے باب نمبر:۱۸ کی آیت نمبر:۱۸ کے الفاظ یہ ہیں: ''اپنی بیوی کی بہن سے شادی نہ کرو، اور نہ اس کے ستر کو منکشف کرو'' اگر یہاں نسخ کا قول نہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک ساتھ دو بہنوں کو نکاح میں رکھ کر امر حرام کا ارتکاب کیا۔ (معاذ اللہ)

(۴) بائبل میں عبرانیوں کے نام پولس کے خط کے ساتویں باب کی آیت نمبر:۱۸

۱۔ضیاء النبی: ۶/ ۲۳۲؛ مطبع سابق۔

میں یہ الفاظ موجود ہیں:

''یقیناً سابقہ احکام کو ان کی کمزوری اور ان کے بے اثر ہونے کی وجہ سے منسوخ کر دیا جاتا ہے۔''

اسی باب کی آیت نمبر:۱۳ میں ہے: ''نئے عہد کا لفظ استعمال کر کے اس نے پرانے عہد کو منسوخ کر دیا ہے، اب جس کو منسوخ قرار دیا گیا ہے یا جو پرانا ہو رہا ہے وہ مٹ جانے کے قریب ہے۔''

(۵) عبرانیوں کے نام خط کے ساتویں باب کی آیت نمبر:۱۲ میں سنیٹ پال کا یہ قول موجود ہے:

''جب امامت تبدیل ہو رہی ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ شریعت بھی تبدیل ہو۔''(۱)

ان تمام مثالوں کو پیش کر کے علامہ پیر کرم شاہ ازہری نے مستشرقین سے یہ سوال کیا ہے کہ:

''اگر عہد نامہ قدیم وجدید میں نسخ کا اصول موجود ہونے کے باوجود ان کے کلام خداوندی ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا اور نہ ان کی الہامی حیثیت مشکوک ہوتی ہے تو نسخ کے اس اصول کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا مصنف کہنا، اور اسے کلام خداوندی تسلیم نہ کرنا کہاں کی علمیت اور کہاں کا انصاف ہے؟(۲)

❁ تدوین قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات

قرآن کریم کے استناد واعتماد کو مجروح کرنے کی خاطر مستشرقین قرآن کریم کی تدوین کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بناتے ہیں، اس سے ایک طرف ان کی غرض قرآن کریم میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے، تو دوسری طرف توریت وانجیل میں تحریف کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اسے قرآن حکیم کی طرف لوٹانا ہے، تاکہ جس طرح ان کی مذہبی کتابیں تحریفات کے ناتے اپنا درجہ استناد کھو بیٹھی ہیں، اسی طرح قرآن میں بھی تحریفات کی گنجائش نکال کر

۱۔ضیاء النبی:۶/۲۳۸؛مطبع سابق۔

۲۔ضیاء النبی:۶/۲۳۸؛مطبع سابق۔

اسے بھی مسلمانوں کے درمیان پایہ اعتبار سے ساقط کر کے غیر مستند قرار دے دیا جائے، علامہ پیر کرم شاہ ازہری فرماتے ہیں:

''مستشرقین جن کی اسلام کے متعلق کاوشوں کے پیچھے ہمیشہ مذہبی تعصب کارفرما رہا ہے، انہوں نے اس صورتحال سے نمٹنے کی تدبیر یہ نکالی ہے کہ قرآن حکیم نے ان پر اپنے مذہبی صحائف میں تحریف کا جو الزام عائد کیا ہے وہ اسے قرآن حکیم کی طرف لوٹانے کی کوشش کرتے ہیں، پہلے تو وہ قرآن کو کلام خداوندی ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے، بلکہ وہ اسے حضور کی تصنیف قرار دیتے ہیں پھر ذرا آگے بڑھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قرآن جو آج مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، یہ بعینہ وہ قرآن نہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا، بلکہ مرور زمانہ سے اس میں بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن کریم کو ایک مصحف میں جمع کرنے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں لغت قریش کے مطابق قرآن حکیم کے نسخے تیار کرا کر مختلف علاقوں میں بھیجنے کی جو کوششیں ہوئیں، ان کو دلیل بنا کر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ قرآن حکیم حضور کے زمانے میں تحریر نہیں ہوا، بلکہ اس کو بعد میں آپ کے جانشینوں نے تحریر کیا۔''(۱)

تدوین قرآن کے حوالے سے چند مستشرقین کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

(۱) بلاشیر کہتا ہے:

''وحی کی تدوین کا خیال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ میں مقیم ہونے کے بعد پیدا ہوا، نیز قرآن کی تدوین جزوی تھی اور اس کا انحصار انفرادی کوششوں پر تھا، جس کی وجہ سے اختلافات کا رونما ہونا قدرتی بات تھی۔''(۲)

(۲) آرتھر جیفری کہتا ہے:

''یہ بات واضح ہے کہ آپ اپنی امت کے لئے ایک کتاب تیار کر رہے تھے، جس کی آپ کی امت کے نزدیک وہی حیثیت ہو جو یہودیوں کے نزدیک عہد نامہ قدیم کی اور عیسائیوں کے نزدیک عہد نامہ جدید کی ہے، لیکن کتاب کی تکمیل سے پہلے آپ کا انتقال

۱۔ ضیاء النبی: ۶/ ۵۶۵؛ مطبع سابق۔

۲۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری: ص: ۱۱۰۔

ہو گیا، اور آج قرآن میں جو کچھ ہے یہ وہ ہے جس کو آپ کے پیروکار آپ کے انتقال کے بعد جمع کرنے میں کامیاب ہوئے، اور انہیں آپ کے الہامات کے مجموعے کے طور پر شائع کر دیا۔"(۱)

(۳) ایچ، اے، آر گب نے کہا۔

"یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہے کہ تالیف قرآن کا کام آپ کی زندگی میں شروع ہو گیا تھا، لیکن اس کی تکمیل آپ کے انتقال سے کچھ عرصے بعد ہوئی۔"(۲)

مذکورہ بالا اقتباسات سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) وحی کی تدوین کا خیال رسول اللہ ﷺ کو شروع میں نہیں ہوا تھا، بلکہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد ہوا تھا۔

(۲) تدوین قرآن کا انحصار انفرادی کوششوں پر تھا، اجتماعی طور پر اس کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔

(۳) انفرادی اور جزوی تدوین ہی کی بنا پر قرآن کریم میں اختلافات موجود ہیں۔

(۴) قرآن کی تکمیل عہد رسالت میں نہیں ہو پائی تھی، آپ کے بعد آپ کے پیروکاروں نے اس میں کچھ زیادتی کر کے آپ کے الہامات کے نام سے اسے منظر عام پر لائے۔

تدوین قرآن کی تاریخ جس نے بھی پڑھی ہوگی اسے بخوبی معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا مفروضوں میں ایک بھی مفروضے کا حقیقت وواقعیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے، انفرادی طور پر ہر ایک مفروضے کا جواب دینے کے بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن سے لے کر تدوین قرآن تک کی تاریخ پیش کر دی جائے، تاکہ قارئین کو پتہ چل جائے کہ مستشرقین اپنا مدعا ثابت کرنے کے لئے ایک نہیں سو سو جھوٹ بھی بولنے میں دریغ نہیں کرتے ہیں، بلکہ اپنی بات منوانے کے لئے نہ صرف یہ کہ وہ تاریخی حقائق کو مسخ کرتے ہیں، بلکہ تاریخ سازی کا تاریخ ساز کارنامہ بھی انجام دینے سے نہیں چوکتے ہیں۔

۱۔ اسلام، محمد اینڈ ہز ریلیجن: ص: ۲۷۔

۲۔ دی انسائیکلو پیڈیا آف لونگ فیتھ: ص: ۱۲۸؛ ہاچنس گروپ آف ساؤتھ افریقہ۔

✿ عہد رسالت میں حفاظت قرآن کا اہتمام

نزولِ قرآن کی ابتدائی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت اس مہتم بالشان کلام کے نزول کی ابتدا ہوئی تھی، اس وقت عرب میں پڑھنے لکھنے کا رواج اتنا نہیں تھا جتنا کہ دورِ حاضر میں ہے، اس دور میں آج کی طرح صاف ستھرے چمکدار کاغذ مہیا نہیں تھے، عرب کا زیادہ تر اعتماد حفظ واتقان پر تھا، اہلِ عرب کی ذہانت کا عالم یہ تھا کہ ہزاروں اشعار پر مشتمل دیوان زبانی یاد کر لیتے تھے، اگر کوئی چیز لکھتے بھی تو یادداشت کے لئے نہیں بلکہ وقتِ ضرورت اپنے حافظے کی تائید کے لئے لکھا کرتے تھے، اس زمانے میں کاغذ دستیاب نہ ہونے کے ناتے لوگ ہڈیوں، چمڑوں اور کھجور کی چھالوں پر لکھائی کرتے تھے، گویا اس عہد میں کسی چیز کی حفاظت کے دو ہی طریقے معروف تھے، ایک تو حفظ وضبطِ صدر، دوسرے کتابت، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی حفاظت وصیانت کے لئے دونوں طریقے بروئے کار لائے، چنانچہ جب جبرئیل علیہ السلام قرآن لے کر نازل ہوتے تو پہلے تو آپ اسے یاد کر لیتے تھے، پھر کاتبینِ وحی کو بلا کر اسے لکھوا بھی دیتے تھے، حفاظتِ قرآن کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کتنا سنجیدہ تھے، اس کا اندازہ آپ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں کہ جب جبرئیل امین علیہ السلام قرآن کا کوئی حصہ لے کر نازل ہوتے اور اسے آپ کے سامنے پڑھتے تو سرکار صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس خوف سے کہ کہیں کوئی حصہ یاد کرنے سے نہ رہ جائے، جبرئیل کے پڑھنے کے ساتھ آپ بھی پڑھتے رہتے، تاکہ ادھر جبرئیل علیہ السلام کی قرأت ختم ہو ادھر وحیِ ربانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں محفوظ ہو جائے، اس پر رب تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا

[طٰہٰ: ۱۱۴]

ترجمہ:

اور قرآن میں جلدی نہ کرو، جب تک اس کی وحی تمہیں پوری نہ ہو لے، اور عرض کرو کہ اے میرے رب مجھے علم زیادہ دے۔

اسی طرح یہ آیت کریمہ بھی آپ کی تسلی کی خاطر نازل ہوئی:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ

[قیامۃ:۱۶]

تم یاد کرنے کی جلدی میں قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دو، بے شک اس کا محفوظ کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے تو جب ہم اسے پڑھ چکیں تو اس پڑھے ہوئے کا اتباع کرو۔

ان آیات کے نزول کے بعد سرکار جبرئیل علیہ السلام کی قراءت ختم ہونے کا انتظار فرماتے، پھر آپ اسی طرح پڑھتے جس طرح جبرئیل علیہ السلام پڑھتے، اس کے بعد آپ صحابہ کرام کو پڑھ کر سناتے، اور انہیں آداب تلاوت سے آگاہ فرماتے، پھر آپ کاتبین وحی کو بلواتے، اور جتنا حصہ نازل ہوتا اسے آپ سپرد قرطاس کروادیتے، لکھنے کا کام خاص کاتبین وحی تو کرتے ہی صحابہ کرام بھی جنہیں قرآن یاد ہوجاتا وہ بھی اسے لکھ کر محفوظ کردیا کرتے، اس کے بعد لکھا ہوا حصہ کاشانۂ اقدس میں رکھ دیا جاتا اور یہ کام اسی طرح جاری رہا حتی کہ نزول قرآن کا سلسلہ مکمل ہوگیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ عہد رسالت میں قرآن کی حفاظت کے لئے ہر وہ طریقہ اپنایا گیا جو اس دور میں رائج تھا، جن میں سے معروف طریقے حفظ، ترتیل اور کتابت تھے، علاوہ ازیں حفاظت قرآن کا ایک اہم ذریعہ صحابۂ کرام کا وہ جذبۂ شوق بھی تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر اپنے کلام کی حفاظت کے لئے ودیعت فرمادی تھی، علامہ پیر کرم شاہ ازہری کے الفاظ میں:

"سب جانتے ہیں کہ صحابۂ کرام قرآن کریم کو حفظ کرتے، اپنے اہل خانہ اور اپنے بچوں کو بھی قرآن حکیم یاد کراتے، وہ راتوں کی تنہائیوں میں اپنے گھروں کے اندر کھڑے ہوکر اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہوہوکر اور حالت نماز میں قرآن حکیم کی طویل قراءت کرکے اپنے قلب وروح کو فرحت وانبساط بخشتے۔"(۱)

۱۔ضیاء النبی:۶/۵۷۸؛ مطبع سابق۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی سارا قرآن ضبط تحریر ہو چکا تھا، کاتبین وحی نے حضور ﷺ کی موجودگی میں جو کچھ لکھا تھا اسے حضور ﷺ کے کاشانۂ اقدس میں محفوظ کر دیا گیا تھا، علاوہ ازیں متعدد صحابۂ کرام نے قرآن کی کئی کئی سورتیں لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لی تھیں، بعض صحابۂ کرام ایسے بھی تھے جن کے پاس پورا قرآن مجید کتابت شدہ شکل میں موجود تھا، جن میں حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل، حضرت زید بن ثابت، اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین کے اسماء قابل ذکر ہیں۔(۱)

✿ عہد صدیقی میں کتابت قرآن

جنگ یمامہ میں ستر حفاظ کی شہادت نے ذمہ دار صحابہ کرام کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر اسی طرح حفاظ قرآن جنگوں میں شہید ہوتے رہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن کے کچھ اجزا سے محروم ہونا پڑے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اس خطرے کا اظہار حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کیا، اور مشورہ دیا کہ قرآن کو مختلف سینوں اور تحریروں سے منتقل کر کے ایک مصحف کی شکل دے دی جائے، خلیفۂ اول نے ابتدا میں اس کام سے انکار کیا کہ جس کام کو حضور ﷺ نے اپنے زمانے میں نہیں کیا تھا اسے ہم کیسے کر سکتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر اس کام کی اہمیت کا احساس پیدا کر دیا، چنانچہ اس عظیم کام کے لئے باتفاق صحابہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا گیا، حضرت ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس کام کی نزاکت کا کتنا احساس تھا اس کا اندازہ آپ ان کے اس قول سے لگا سکتے ہیں فرماتے ہیں:

"فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل مما امرنی بہ من جمع القرآن"(۲)

خدا کی قسم اگر مجھے کسی پہاڑ کو ہٹانے کا حکم دیتے، تو یہ کام میرے لئے جمع قرآن

۱۔مباحث فی علوم القرآن،ص:۱۳۳،مطبوعہ بیروت:۱۹۸۰ء۔

۲۔مباحث فی علوم القرآن،ص:۱۲۶،مطبوعہ،بیروت:۱۹۸۰ء۔

سے آسان ہوتا۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مختلف سینوں اور کتابت شدہ اجزا سے قرآن کو یکجا کرنا شروع کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ جس کے پاس قرآن کا جو بھی حصہ لکھا رکھا ہو حضرت زید رضی اللہ عنہ کے پاس لاکر لکھوادے، چنانچہ جس کے پاس بھی لکھا ہوا قرآن کا کوئی حصہ ہوتا وہ اسے لاکر حضرت زید رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیتا، حضرت زید رضی اللہ عنہ ہر تحریر لانے والے شخص سے پہلے دو گواہ طلب کر لیتے جو اس بات کی گواہی دیتے کہ واقعی یہ تحریر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لکھی گئی تھی، دو لوگوں سے گواہی لینے کا حکم خود خلیفہ وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دیا تھا، چنانچہ آپ نے حضرت عمر و زید رضی اللہ عنہما سے کہا:

"اقعدا علی باب المسجد فمن جاء بشاھدین علی شیء من کتاب اللہ فاکتباہ" (۱)

تم دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو کوئی قرآن کا کوئی حصہ دو گواہوں کے ساتھ لے کر آئے اسے لکھ لو۔

گویا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اس قرآن حکیم کو جو عہد رسالت میں مکمل نازل ہو کر لکھا جا چکا تھا، اور ہزاروں سینوں میں محفوظ تھا، آپ نے اسے ایک صحیفے میں الہامی ترتیب کے ساتھ مرتب کر دیا۔ (۲)

✿ عہد عثمانی میں کتابت قرآن

قرآن حکیم کا نزول سات لہجوں میں ہوا تھا، لہجوں کا اختلاف اہل عرب کے نزدیک ایک معمولی سی چیز تھی، لیکن جب دین اسلام عرب کی سرحدوں کو پار کر کے عجم میں پہونچا تو وہاں کے لوگوں میں بھی قرآن کریم کے حفظ و قراءت کا شوق پیدا ہوا، لیکن جب وہ کسی معلم کے پاس قرآن سیکھنے کی غرض سے جاتے تو اس کو کسی اور لہجے میں قراءت کرتے ہوئے دیکھتے، جب کہ دوسرا معلم کسی اور لہجے میں تلاوت کر رہا ہوتا، یہ صورتحال ان کے لئے ایک تذبذب اور مشکوکانہ کیفت پیدا کر دیتی، کبھی کبھی اس صورتحال سے جنگ و جدال کی کیفیت

۱۔ مباحث فی علوم القرآن: ص: ۱۲۷، مطبوعہ بیروت: ۱۹۸۰ء۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۵۸۶؛ مطبع سابق۔

پیدا ہو جاتی، ملت اسلامیہ کی وحدت کے لئے یہ بات بہت خطرناک تھی، خوف تھا کہ وہ کتاب جو تمام دنیا کے لوگوں کو ایک لڑی میں پرونے کی غرض سے نازل کی گئی تھی، وہی ملت اسلامیہ کے انتشار کا سبب بن جاتی، اب ضرورت تھی کہ قرآن کریم کو صرف ایک لغت اور لہجے میں رکھا جائے، اس خطرے کا اظہار سب سے پہلے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے کیا، اس خطرہ کو لے کر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کس قدر پریشان تھے، اس کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے، آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"أدرك الأمة قبل أن يختلفوا اختلاف اليهود والنصارىٰ" (1)

امت میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف پیدا ہونے سے پہلے اس کی خبر گیری فرمائیے۔

معاملہ بڑا نازک تھا، اس لئے سب سے پہلے خلیفۂ وقت نے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا، سب نے آپ کی حمایت کی، اس کے بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے کاشانۂ اقدس سے قرآن کا وہ نسخہ منگوایا گیا جسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقائے کار نے مرتب کیا تھا، پھر صحابۂ کرام میں سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ جیسے تجربہ کار صحابہ کرام کو اس بات پر مامور کیا گیا کہ وہ قرآن کو لغت قریش کے مطابق ایک صحیفے میں جمع کریں، نامزد صحابۂ کرام نے اس حکم کی تعمیل بڑے حسن وخوبی کے ساتھ کی، کسی امر میں کوئی اختلاف وانتشار کی نوبت نہیں آئی، ڈاکٹر مصطفیٰ شبلی نے لکھا ہے:

"فلم يختلفوا في شيء إلا في كلمة التابوت، فقال زيد: تكتب بالهاء، وقالوا: تكتب بالتاء، فعرضوا الأمر على عثمان، فأمرهم بكتابته بالتاء" (2)

صحابۂ کرام نے کسی امر میں اختلاف نہیں کیا، سوائے کلمۂ تابوت کے، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اسے ھا کے ساتھ لکھنے کا مشورہ دیا، اور دیگر حضرات نے تا کے ساتھ، معاملہ حضرت

1۔ مباحث فی علوم القرآن، ص: ۱۲۹، مطبع سابق۔

2۔ اصول الفقہ الاسلامی: ۱/۹۶۔

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں پیش کیا گیا، آپ نے تا کے ساتھ لکھنے کا حکم دیا۔

اس صحیفے کا نام "المصحف الإمام" رکھا گیا، اور اسے تمام اسلامی قلمرو میں بھیجا گیا، ساتھ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے یہ حکم بھی جاری کیا:

"إني قد صنعت كذا وكذا ومحوت ما عندي، فامحوا ما عندكم" (۱)

میں نے ایسا ایسا کیا ہے، اور جو میرے پاس اس نسخے کے علاوہ نسخے تھے سب کو مٹا دیا ہے، لہٰذا تم بھی دیگر تمام نسخوں کو تلف کردو۔

خطرہ کی راہ کو دائمی طور سے بند کرنے کی غرض سے تمام نسخوں کو جلا دیا گیا، بظاہر یہ کام ملت کے انتشار کا سبب بن سکتا تھا، مگر چونکہ اس کام کے پیچھے نیک مقصد کارفرما تھا اس لئے ایسا نہ ہوا، اور اس طرح قرآن کی حفاظت کا جو وعدہ رب قدیر نے کیا تھا وہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہونچا۔

یہ تدوین قرآن کی تاریخ ہے جسے ہم نے اختصار کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کردی ہے، اس تاریخ کو پڑھ کر مستشرقین ہمیں بتائیں کہ آپ کی یہ باتیں کہاں تک صحیح ہیں کہ:

(۱) وحی کی تدوین کا خیال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع میں نہیں ہوا تھا بلکہ مدینہ میں قیام کے بعد ہوا تھا۔

(۲) تدوین قرآن کا انحصار انفرادی کوششوں پر منحصر تھا، اجتماعی طور سے اس کی تدوین وحفاظت کا اہتمام نہیں ہوا تھا۔

(۳) جزوی ترمیم کے ناتے قرآن کریم میں اختلافات موجود ہیں۔

(۴) قرآن کی تکمیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نہیں ہو پائی تھی، آپ کی وفات کے بعد آپ کے پیروکاروں نے اس میں حذف واضافہ کرکے آپ کے الہامات کے نام سے اسے شائع کردیا تھا۔

یہ کتنا بڑا مذاق ہے کہ جس کتاب کی حفاظت کے لئے اتنی کوششیں کی گئی، اس کتاب کی صحت کو تو مشکوک ثابت کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ صحیفے جن کے لکھنے والوں کا

۱۔ مباحث فی علوم القرآن: ص: ۱۳۰: مطبوعہ، بیروت: ۱۹۸۰ء۔

بھی پتہ نہیں اور جن کے مختلف ایڈیشنوں میں متعدد اختلافات موجود ہیں، ان صحیفوں کو مستند الہامی کتابیں قرار دی جائیں۔(۱)

بحث کو ختم کرنے سے قبل تدوین قرآن کے حوالے سے چند مستشرقین کے خیالات کو پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ:

''ہمارے سامنے ایسے دلائل ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے اصحاب میں سے اکثر افراد نے اپنے پیغمبر کی زندگی ہی میں قرآن کی متفرق سورتیں املا بھی کر رکھی تھیں، جس کے مجموعے میں تقریباً سارا قرآن سمٹ آیا تھا۔(۲)

کیا یہ اقتباس مستشرقین کے اس مفروضے کی تردید نہیں کر رہا ہے کہ ''قرآن کی تکمیل حضور ﷺ کے عہد میں نہیں ہو پائی تھی؟''

سر ولیم میور ہی کا ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو:

''زید نے ایک ایک تحریر کو سمیٹ لیا، اور حفاظ قرآن کو اپنے گردو پیش بٹھا کر دو یا تین سال میں یہی قرآن جو ہمارے ہاتھوں میں ہے مرتب کیا، یہ نسخہ اس ترتیب کے مطابق ہے جو زید نے لکھ کر آنحضور کے بالمواجہ آپ کو سنایا کرتے تھے۔''(۳)

کیا یہ نظریہ مستشرقین کے اس نظریے کی تردید نہیں کر رہا ہے کہ ''تدوین قرآن کا انحصار انفرادی کوششوں پر منحصر تھا؟''

منٹگمری واٹ نے لکھا ہے:

''یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں کی موجودہ ترتیب محمد ﷺ نے خود دی تھی۔''(۴)

ڈاکٹر لورا فیشیا نے لکھا ہے کہ:

''قرآن کریم کے ربانی سرچشمے پر ایک دوسری دلیل یہ ہے کہ اس کے نصوص نزول

۱۔ضیاء النبی: ۶/۶۰۲؛ مطبع سابق۔

۲۔رسول مبین: ص: ۱۸۵؛ مطبوعہ مقبول اکیڈمی، لاہور: ۱۹۵۳ء۔

۳۔رسول مبین: ص: ۱۸۶؛ مطبوعہ مقبول اکیڈمی، لاہور: ۱۹۵۳ء۔

۴۔محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس مین: ص: ۱۶؛ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس: ۱۹۱۹ء۔

قرآن سے لے کر آج تک صدیاں گزر جانے کے باوجود تحریف سے پاک ہیں، اور جب تک کائنات کا وجود رہے گا، اس کے نصوص اسی طرح صاف وشفاف باقی رہیں گے۔"(۱)

کیا مذکورہ بالا اقتباس مستشرقین کے اس نظریئے کی نفی نہیں کر رہا ہے کہ "جزوی ترمیم کے ناتے اس میں اختلاف کا پیدا ہونا فطری بات تھی؟"

تدوین قرآن سے متعلق مستشرقین کے چند وسوسے اور ان کے جوابات

اس سلسلے میں پہلا شبہ جو عہد نبوی میں قرآن کی باضابطہ تدوین کو لے کر لاحق ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر عہد نبوی میں پورے قرآن کی تدوین کیوں نہیں ہوئی؟ اس کا جواب خود مستشرقین نے دو طرح سے دیا تھا ایک یہ کہ اس وقت کاتبین وحی کی کمی کے ناتے ایسا نہ ہو سکا، دوسرے یہ کہ چونکہ آنحضرت ﷺ کو قرب قیامت کا حد درجہ شدید احساس تھا اور آپ جانتے تھے کہ یہ تمام علوم قیامت آنے کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے، اس لئے آپ نے قرآن مجید کے جمع کرنے کی ضرورت پر سرے سے زور ہی نہیں دیا۔

مگر جب ہم تاریخی حقائق پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کے یہ دونوں مفروضے سرے سے غلط ہیں، چنانچہ ان کا یہ کہنا کہ قرآن کی تدوین عہد رسالت میں کاتبین وحی کی کمی کے ناتے نہیں ہوئی سو یہ غلط ہے، مختلف روایتوں سے ثابت ہے کہ کاتبین وحی کی تعداد ۴۳ رتھی، خود مستشرق بلاشیر نے ۴۰ رکا اقرار کیا ہے۔(۲)

یوں ہی یہ کہنا کہ قرب قیامت کے شدت احساس نے حضور ﷺ کو تدوین قرآن سے مانع رکھا اس شوشے کو سب سے پہلے مشہور مستشرق کازانوفا نے چھوڑا تھا جس کی تردید مسلم دانشوروں نے بہت پہلے کر دی تھی خود کچھ مستشرقین اس کی اس بے بنیاد رائے کی تردید کر چکے ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں بلاشیر نے لکھا ہے کہ:

۱۔ الرسول فی کتابات المستشرقین بحوالہ اسلام اور مستشرقین، ص: ۲۳۱؛ مطبع سابق۔

۲۔ جمع وتدوین قرآن، مشمولہ اسلام اور مستشرقین: ۷ر۱۰؛ مطبع سابق۔

"کازانوفا کی مذکورہ رائے کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر دیگر اسلامی علوم مثلاً علم میراث وغیرہ کو لے کر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوگا کہ اگر قربِ قیامت کے احساس کی شدت ہی تدوین قرآن سے مانع تھی تو پھر دیگر اسلامی علوم کے سکھانے اور ان کی حفاظت وصیانت کا حکم دینے سے اس شدت احساس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہ باز رکھا۔

اس شبہے کا صحیح جواب یہ ہے کہ عہد رسالت میں باضابطہ قرآن کی تدوین نہ ہو پانے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ چونکہ قرآن مجید وقتاً فوقتاً ۲۳ ربرس کی مدت میں نازل ہوتا رہا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تردد لاحق رہتا تھا کہ معلوم نہیں کب کون سی آیت نازل ہو اور کون سی منسوخ ہو جائے یا کسی آیت کا حکم تو باقی رہے مگر اس کی تلاوت منسوخ کر دی جائے۔ (اس لئے باضابطہ تدوین قرآن کا کام عہد رسالت میں نہ ہو سکا) تاہم یہ امر واقعہ تھا کہ پورا قرآن مجید عہد نبوی ہی میں لکھا جا چکا تھا گو وہ ایک مصحف میں بین الدفتین جمع نہ تھا۔ (۱)

دوسرا اہم اعتراض مستشرقین یہ کرتے ہیں کہ قرآن کا جامع اول کون ہے؟ چنانچہ اس سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا کا ایک مستشرق مقالہ نگار لکھتا ہے۔

"ایک روایت میں ہے کہ کسی موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کوئی آیت دریافت کی تو انہیں بتایا گیا کہ وہ فلاں صاحب کو یاد تھی جو غزوہ یمامہ میں شہید ہو گئے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سخت افسوس ہوا اور انہوں نے قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم دیا، چنانچہ اس امر کے بموجب سب سے پہلے قرآن ایک مصحف میں جمع کیا گیا، لیکن بعض دوسری روایتوں کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کام شروع کیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نے جمع قرآن کا کام انجام دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تدوین کی۔ (۲)

حقیقت یہ ہے کہ جامع اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پہلی روایت جس میں جنگ یمامہ میں شہید کے ساتھ قرآن کے کچھ حصے کے ضیاع کا ذکر ہے اس کا جواب علامہ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے یہ دیا کہ یہ روایت منقطع ہے اور مقام تحقیق میں

۱۔ جمع وتدوین قرآن، مشمولہ اسلام اور مستشرقین: ۷ر۱۱؛ مطبع سابق۔

۲۔ جمع وتدوین قرآن، مشمولہ اسلام اور مستشرقین: ۷ر۱۲؛ مطبع سابق۔

منقطع روایت سے استدلال کرنا نا انصافی ہے، خاص طور سے اس موقع پر جب کہ صحیح اور غیر منقطع روایتیں اس کے مقابلے میں موجود ہوں، علامہ ابن حجر کے بقول ہر وہ روایت جس سے حضرت عمر کے جامع اول ہونے کا پتہ چلتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہی نے سب سے پہلے جمع قرآن کا مشورہ دیا، یوں ہی مستشرق مذکور کا یہ کہنا کہ جمع کی ابتدا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کی، لیکن تدوین حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے ہاتھ پر ہوئی، یہ بھی تاریخی غلطی ہے کیوں کہ خود حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جو عہد صدیقی میں جمع قرآن کے لئے تشکیل شدہ ٹیم کے سرخیل تھے، ان کا بیان ہے:

"حتی وجدت آخر سورة التوبة مع ابی خزیمة الانصاری لم اجدها مع احد غیره "لقد جاء کم رسول من أنفسکم عزیز علیه الخ"

[توبہ، ۱۲۷]

یہاں تک کہ سورۂ توبہ کا آخری حصہ مجھے ابوخزیمہ انصار کے پاس ملا، آپ کے علاوہ اور کسی کے پاس نہ مل سکا، وہ حصہ یہ ہے "لقد جاءکم رسول الخ"۔

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ عہد صدیقی میں میں نے پورا قرآن ڈھونڈھ کر جمع کر لیا تھا، مجھے تلاش بسیار کے باوجود سورۂ توبہ کا آخری حصہ صرف ایک صحابی رسول حضرت ابوخزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس دستیاب ہوا، اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جمع قرآن کا کام عہد صدیقی میں مکمل ہو چکا تھا، پھر مستشرق مذکور کے اس قول کا کیا مطلب کہ ابتدا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تدوین کی۔

اس سلسلے میں تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ تدوین قرآن میں عام مسلمانوں کو شامل نہیں کیا گیا، بلکہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی ذاتی دلچسپی اور جدوجہد کے نتیجے میں اس کی تدوین عمل میں آئی، چنانچہ بلاشیر ایک جگہ لکھتا ہے:

"طبعاً مسلم معاشرہ کو وحی الٰہی کے ایک معاون نسخے کی حاجت تھی اور ظاہر ہے کہ یہ نسخہ ایسا ہی ہو سکتا تھا جو عام مسلمانوں کی رائے سے مدون کیا گیا ہو، تاکہ اس کو عوامی مقبولیت حاصل ہو، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صحیفے اس معیار پر پورے نہیں اترتے، کیونکہ ان کی حیثیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ذاتی ملکیت کی تھی۔"

عہد صدیقی میں تدوین قرآن کے اسباب وعوامل نیز اس کے پس منظر پر نگاہ ڈالنے کے بعد کیا کوئی دانشمند کہہ سکتا ہے کہ تدوین قرآن میں عام مسلمانوں کو شامل نہیں کیا گیا، جب کہ معتبر روایت سے ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عام لوگوں کے درمیان اعلان فرمادیا تھا کہ جو کچھ تمہارے پاس لکھا رکھا ہوا سے لے آؤ، چنانچہ جس شخص کے پاس قرآن کا کوئی حصہ موجود ہوتا، اسے دو گواہوں کے ساتھ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے حوالے کردیتا، جسے حضرت زید رضی اللہ عنہ قرآن میں ضم کرلیتے تھے، ابن ابی داؤد کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وحضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"اقعدا علی باب المسجد فمن جاء کما بشاهدین علی شیٔ من کتاب الله فاکتباه" (۱)

چوتھا شبہ اس سلسلے میں مستشرقین یہ پیدا کرتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مختلف داخلی وخارجی عوامل واثرات سے متاثر تھے، جن عوامل واثرات کی کارفرمائی فطری طور سے اس کام پر بھی اثر انداز ہوئی، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اس وقت سے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کتابت وحی پر مامور کیا تھا، اپنی وفات (۴۵ھ) تک ممتاز سیرت وشخصیت کے مالک رہے، آپ کی دانائی وبینائی کی شہادت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے مدبر اور دانشمند نے ان الفاظ میں دی ہے:

"إنك رجل شاب عاقل، لا نتهمك وقد كنت تكتب الوحي" (۲)

بلاشبہ تم نوجوان اور عقل مند انسان ہو ہم تم پر کوئی تہمت نہیں لگاتے، اور تم کاتب وحی ہو.....

اس قول میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی چار صفات گنائی ہیں، جو تمام اس عظیم کام کے لئے مخصوص تھیں۔ (۱) نوجوان ہونا؛ (۲) ہوش مند ہونا؛ (۳) متہم ومجروح نہ ہونا؛ (۴) کاتب وحی ہونا۔ یہ چاروں اوصاف فرداً فرداً اور لوگوں میں موجود تھے،

۱۔ جمع وتدوین قرآن، مشمولہ اسلام اور مستشرقین: ۷ر۱۵؛ مطبع سابق۔

۲۔ مرقاۃ المفاتیح، کتاب فضائل القرآن: ص: ۳۲۲؛ جلد: ۷۔

مگر حضرت زید کے اندران سب کا جمع ہونا آپ کی نمایاں خصوصیت ہے۔(۱)

قرآن کریم پر متفرق اعتراضات وشبہات اوران کے جوابات

قرآن کریم کلام الٰہی ہے اور ہر طرح کے اختلاف وتضاد سے پاک ہے، اس کے اندر نہ کوئی لفظ قابل اعتراض ہے نہ ہی کسی معنی پر اعتراض کیا جاسکتا ہے یہ کلام ہر طرح کی غلطی سے پاک ہے، مگر کچھ دریدہ دہن ایسے بھی ہیں جو اپنے دماغی فتور کو قرآن کریم کے اندر تلاشتے ہیں، ایسے لوگ ہر دور میں پائے گئے، تاریخ استشراق میں بھی ہمیں کچھ ایسے لوگ ملتے ہیں جو قرآن کریم پر اعتراض کرتے ہیں، اس میں تضاد واختلاف دکھانے کی سعیٔ نامحمود کرتے ہیں، افسوس ہے کہ جس قرآن کے سامنے فصحائے عرب سرتسلیم خم کردیئے اور اس پر اعتراض نہ کرسکے آج یہ مستشرقین اسی کلام پر اعتراض کرتے ہیں، آیئے ہم ذیل میں چند اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ مشہور مستشرق نولدیکی نے قرآن کو حضور کی تصنیف ثابت کرنے کے لیے قرآن کی آیت:

"ثُمَّ يَأْتِي مِنْ م بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ "فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ"

کا جغرافیائی تجزیہ کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں قرآن پاک پر ریویو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حضرت محمد ﷺ کو عرب سے تو واقفیت تھی لیکن بیرون عرب کا جہاں ذکر کرتے ہیں وہاں ان کی بے خبری کی پردہ دری ہوجاتی ہے، چنانچہ مصر کی زرخیزی کو جہاں بارش تقریباً نہیں دیکھی جاتی ہے وہ دریائے نیل کے سیلاب کے بجائے بارش پر منحصر رکھتے ہیں۔''(۲)

اس بکواس کا تحقیقی جواب سننے سے پہلے اس آیت کریمہ کا ذکر مناسب ہے جس کو لے کر اعتراض کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

۱۔ ایضاً۔

۲۔ اسلام اور مستشرقین: ۷؍۱؍۲۰۱۔

"ثم یاتی من بعد ذٰلك عام فیه یغاث الناس و فیه یعصرون"

[یوسف: ۴۷، ۴۹]

پھر اس کے بعد ایک برس آئے گا جس میں لوگوں کو مینھ دیا جائے گا اور اس میں رس نچوڑیں گے۔

اس آیت کریمہ میں ایک لفظ 'یغاث' ہے جس کا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ 'بارش ہوگی' مستشرق مذکور کے نزدیک مصر کے سلسلہ میں بارش کا ذکر معاذ اللہ، صاحب قرآن کی بے خبری کی دلیل ہے۔

اس کا جواب کئی طرح سے ممکن ہے:

(۱) 'یغاث' کا ماخذ اشتقاق 'غیث' بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی بارش کے ہیں اور 'غوث' بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی مدد کرنے اور نجات دینے کے ہیں، علامہ بیضاوی مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یمطرون فیه من الغیث او یغاثون من القحط من الغوث"[1]

(۲) یعنی اس سال بارش ہوگی، ایسی صورت میں یہ 'غیث' سے مشتق ہوگا، یا اس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں قحط سے نجات دی جائے گی، ایسے میں 'غوث' سے مشتق ہوگا۔

علامہ ثعالبی فرماتے ہیں:

جائز ان یکون من الغیث و ھو قول ابن عباس و جمھور المفسرین ای یمطرون و جائز ان یکون من اغاثھم اللہ اذا فرّج عنھم منه الغوث و ھو الفرج"[2]

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ 'غیث' سے مشتق ہو اور یہی ابن عباس رضی اللہ عنہ اور جمہور مفسرین کا قول ہے معنی یہ ہیں کہ 'ان پر بارش ہوگی' اور ایسا بھی سکتا ہے کہ یہ 'اغاثھم اللہ' سے ہو، یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ اللہ انہیں خوشحال کر دے، ایسی صورت میں یہ 'غوث' بمعنی خوشحالی سے مشتق ہوگا۔

---

[1] تفسیر بیضاوی: ج: ۱/ ۳۹۹۔

[2] جواہر الحسان: ۲/ ۲۲۱۔

اگر لفظ 'یغاث' 'غوث' بمعنی خوشحالی عطا کرنے اور مدد کرنے سے ہو تب تو سرے سے مستشرق مذکور کا اعتراض ہی غلط ہوگا، اور اگر جمہور مفسرین کے مطابق یہ 'غیث' ہی سے مشتق ہو تو بھی مستشرق مذکور کا یہ دعویٰ کہ مصر میں بالکل بارش ہوتی ہی نہیں غلط ہے، بارش کم سہی مگر اس کا مطلقاً انکار خلاف واقعہ ہے بلکہ خود موصوف کی بے خبری کی واضح دلیل ہے، چنانچہ یعقوبی نے کتاب البلدان میں لکھا ہے کہ:

''مصر کے سواحل پر کسی قدر بارش ہوتی ہے۔''(۱)

الحضارۃ المصریہ میں ہے کہ:

''یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں کہ وادیٔ نیل بارش سے محروم ہے۔''(۲)

خود مشاہدہ بھی اس امر پر گواہ ہے کہ آج بھی کبھی کبھی مصر کے سواحل پر بہت زیادہ تو نہیں لیکن کچھ بارش تو ہوتی ہی ہے جیسا کہ خود وہاں کے رہنے والوں کا بیان ہے، ایسے میں مستشرق مذکور کا یہ کہنا کہ 'مصر میں تقریباً بارش نہیں دیکھی جاتی' واقعہ، جغرافیہ اور خود مشاہدہ کے ساتھ کھلی ہوئی ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے؟

۲۔ مستشرقین نے قرآن کریم کے لسانی وادبی اقدار کو اپنے اعتراضات کا ہدف بنایا ہے چنانچہ قرآن مجید کے بعض الفاظ وکلمات کے بارے میں چند مستشرق محققین کی رائے یہ ہے کہ عربی کے بجائے دوسری زبان کے ہیں، اس سے مستشرقین کا مقصود ایک طرف یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن کی عربیت خالص اور کامل نہیں ہے، تو دوسری طرف ان بہت ساری آیات کی صداقت کو چیلنج کرنا ہے جن میں قرآن کو خالص عربی زبان میں نازل کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

شیخ انور جندی نے ان کے اس بکواس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

''قرآن مجید کے بعض الفاظ وکلمات کے بارے میں چند محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ عربی کے بجائے دوسری زبانوں کے ہیں، مستشرقین نے ان کی اس تحقیق کو سند تسلیم کرتے ہوئے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ قرآن کی عربیت کامل وخالص نہیں ہے، حالانکہ

۱۔ کتاب البلدان: ص: ۳۴۰۔

۲۔ الحضارۃ المصریہ ص ۸ بحوالہ اسلام اور مستشرقین: ۷/۲۔

بظاہر غیر عربی نظر آنے والے یہ الفاظ حقیقۃً غیر عربی نہیں ہیں، بلکہ وہ قدیم زبان میں تجارت، سفر اور دوسری قوموں کے اختلاط کی وجہ سے داخل ہو گئے تھے اور زبانوں کے عام قاعدے اور مزاج کے مطابق وہ اصل عربی زبان کا جز بن کر استعمال ہونے لگے تھے، اسی لیے قرآن مجید نے بھی ان کا استعمال کیا، اور خدا نے اپنے بندوں سے انہیں کی زبان میں گفتگو کی، یہ بات نامناسب اور غیر معقول بھی ہے کہ قرآن مجید استعمال تو ایسے الفاظ کرے جو غیر عربی ہوں یا عربوں کے لیے نامانوس ہوں اور ان کو 'عربی مبین' کا نام دے، گویا ان کو ایسے الفاظ میں خطاب کرے جن کو وہ سمجھ ہی نہ سکیں۔

محققین نے ایسے الفاظ کی تحقیق کی تو ثابت ہوا کہ یہ الفاظ اصلاً عربی ہی تھے، بعد میں حبشی، سریانی اور فارسی زبانوں میں بھی دخیل اور رائج ہوئے، یہ اعتراض پہلے بھی کیا گیا ہے، اسی لیے امام طبری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والے کسی صاحب عقل سلیم سے اس اعتقاد کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ قرآن مجید کے چند الفاظ فارسی ہیں، بعض نبطی ہیں، کئی حبشی ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ"

[حم سجدہ: ۴۴]

اور اگر ہم قرآن کو عجمی زبان میں اتارتے تو کہتے کہ اس کی آیتیں کیوں کر مفصل نہیں بیان کی گئیں۔

۳۔ مستشرقین کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ حروف مقطعات کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ یہود کی کتابوں سے متاثر ہوئے یعنی یہود کی کتابوں کا مطالعہ کر کے آپ نے قرآن کے شروع میں حروف مقطعات رکھے ہیں، بظاہر یہ ایک سادہ سا اعتراض ہے لیکن اس کی سنگینی کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ اگر مستشرقین کا یہ مفروضہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر لازمی طور سے ان کا یہ مفروضہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی کریم نے قرآن میں اپنی طرف سے ترمیم اور حذف و اضافے سے کام لیا ہے، پھر آگے بڑھ کر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ قرآن وحی الٰہی نہیں بلکہ سرکار ﷺ کی اپنی تصنیف ہے۔

حالانکہ اگر حقیقت کی نظر سے نزول قرآن کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کر لیا جائے تو

اس شبہے کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے، کیا مستشرقین کو یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ سورتیں جن کے شروع میں حروف مقطعات ہیں مکی ہیں، جہاں یہودی تھے ہی نہیں، مدنی سورتوں میں سے سورۃ البقرہ اور آل عمران کے سوا کسی بھی سورت کے آغاز میں حروف مقطعات نہیں ہیں، جب کہ مدینہ میں یہودیوں کی کثرت تھی، پھر ان حروف مقطعات کے سلسلے میں یہودیوں سے اثر پذیری کی یہ منطق کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے؟ اگر اثر قبول کرنے والی بات صحیح ہوتو مکی سورتوں کے بجائے مدنی سورتوں کے شروعات میں حروف مقطعات کے استعمال کی شرح زیادہ ہونی چاہئے کیوں کہ مکہ کی بہ نسبت مدینہ میں یہودیوں سے استفادہ اور ان سے اثر پذیری آسان تھی جب کہ ایسا نہیں ہے۔

جرمن مستشرق نولدیکی نے تو حروف مقطعات کے سلسلے میں عجب گل افشانی کی ہے، اس نے اپنی کتاب 'تاریخ قرآن' میں حروف مقطعات کو قرآن کا جز ہی ماننے سے انکار کر دیا ہے، اس کا دعوٰی ہے کہ مصحف عثمانی کی ترتیب سے قبل مسلمانوں کے پاس جو نسخے تھے، یہ حروف مقطعات ان نسخوں کی علامت کے طور پر درج کئے گئے تھے، مثلاً حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے مجموعے کے لئے میم، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مجموعے کے لئے ہا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے نون، گویا یہ حروف مختلف مجموعوں کی ملکیت کی شناخت اور علامت تھے جو غلطی سے مصحف عثمانی کی بعض سورتوں کے شروع میں باقی رہ گئے تھے، اور مرور ایام کے ساتھ قرآن کا جز بن گئے۔ (۱)

عہد رسالت سے لے کر عہد عثمانی تک اگر ہم قرآن کریم کی حفاظت اور تدوین کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو مذکورہ بالا نظریہ کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے، عہد رسالت میں تو حروف مقطعات کی شکل میں ان علامات کو قرآن میں شامل کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں، عہد صدیقی میں قرآن کریم کی ترتیب کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقائے کار کے حزم واحتیاط کے سامنے اس بات کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ ایسے حروف جو غیر قرآن ہوں وہ قرآن میں شامل کر لئے جاتے، عہد عثمانی میں صرف یہ ہوا کہ عہد صدیقی میں مرتب نسخہ کو ایک ہی لغت اور لہجہ میں کر دیا گیا، مجھے بتایا جائے کہ کون سے وقت میں یہ

۱۔ نظرات استشراقیۃ فی الاسلام، ص: ۴۲۔

علامات قرآن کی سورتوں کے شروع میں رکھے گئے، کیا مسٹر نویلد یکی کے ماننے والے اس دعوی پر کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں؟

۴۔ مستشرقین کی اکثریت یہودیت اور عیسائیت سے متعلق ہے جن کی مذہبی کتابیں توریت وانجیل ہیں، ان دونوں کتابوں میں اس قدر تحریفات اور حذف واضافے کی شکل میں تبدیلیاں ہوئیں کہ ان کا ہر لفظ، ہر کلمہ، ہر آیت اور ہر باب شک کے دائرہ میں آکھڑا ہوا، یہ بات ان مستشرقین کے لئے یقینا باعث شرم تھی، اپنی خجالت کو کم کرنے کے لئے اور خود قرآن کریم میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے قرآن کریم میں بھی تحریفات اور تبدیلیاں دکھانے کی کوشش کیں، چنانچہ اس مقصد کی حصولیابی کے بارے میں کازانوفا نامی مستشرق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بار بار اصرار کرتا ہے کہ آپ کو دنیا کے جلد ہی ختم ہو جانے کا یقین تھا، اس لئے آپ نے ارشاد فرمایا تھا:

"انی بعثت فی زمن کنت انا و الساعة کھاتین و اشار الی سبابته ووسطاه"(۱)

میں ایک ایسے زمانے میں بھیجا گیا ہوں کہ میرے اور قیامت کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ ان دونوں انگلیوں کے درمیان فاصلہ ہے یہ کہہ کر آپ نے اپنی شہادت اور بیچ والی انگلی کی طرف اشارہ کیا۔

درحقیقت کازانوفا اس سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاے راشدین نے قرآن مجید میں ایسی تبدیلیاں کر دی ہیں جن سے وہ آپ کی بعثت اور قیامت کے درمیان فاصلہ ثابت کر سکیں جبکہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق بعثت نبوی اور قیامت دونوں متصل تھے، وہ اس تبدیلی کی مثال یہ دیتا ہے کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ:

"وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ"

[الرعد: ۴۰]

۱۔ مسلم؛ باب قرب الساعة؛ رقم الحدیث: ۲۹۵۱۔

اور اگر ہم تمھیں دکھا دیں کوئی وعدہ جو انھیں دیا جاتا ہے یا پہلے ہی اپنے پاس بلائیں تو بہر حال تم پر تو صرف پہونچانا ہے ور حساب لینا ہم پر ہے۔

کازانو فا کا گمان یہ ہے کہ صحابہ کرام نے جب یہ دیکھا کہ وعدہ کے باوجود جب ابھی تک قیامت نہیں آئی تو انھوں نے قرآن کے یقینی انداز بیان کو شک کے صیغے میں تبدیل کر دیا چنانچہ وہ کہتا ہے کہ قرآنی آیت یقینی طور پر اس طرح رہی ہوں گی:

"سنرینك بعض الذی نعدھم"

مستشرقین مجھے بتائیں کہ کیا کازانو فا کے اس خیال کو معقول قرار دیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالی جو زمان و مکان کا مالک ہے ماضی، حال، مستقبل جس کے سامنے یکساں ہیں وہ ایک معمولی بات کو ٹھیک سے بیان نہیں کر سکا، اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ نبی کا انتقال جلد ہو جائے گا، یا وہ دنیا کے خاتمے تک زندہ رہیں گے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ روز قیامت سے قطعی طور سے باخبر ہے، لیکن اس نے نہیں چاہا کہ انسانوں کو اس کی اطلاع دی جائے۔

کازانو فا نے مزید یہ بھی کہا کہ:

"مزید دو آیتیں اور بھی ہیں جن کے وحی ہونے کے بارے میں شک کیا جا سکتا ہے، قرین قیاس بات یہ ہے کہ نبی کی موت کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی نے ان دونوں کا اضافہ کیا ہوگا جن کو بعد میں مسلمانوں نے بھی منظوری دے دی وہ دونوں آیتیں یہ ہیں:

۱۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔[آل عمران:۱۴۴]

اور محمد رسول ہی ہیں جن سے قبل بہت سارے رسول گزرے۔

۲۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۔[الزمر:۳۰۔۳۱]

آپ کو موت آنے والی ہے اور ان کو بھی، پھر تم سب یوم قیامت اپنے رب کے پاس مخاصمت کروگے۔

وجہ صرف یہ ہے کہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ قول 'انی بعثت الخ' سے ثابت ہے کہ قیامت آپ کی بعثت کے ساتھ متصل ہے یعنی آپ کی حیات میں ہی آئے گی، جب کہ ان دونوں آیتوں میں آپ کی موت کے بعد آمد قیامت کا ذکر موجود ہے۔ لیکن میں

مستشرق موصوف سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کو اگر اپنے انتقال سے پہلے ہی قیامت برپا ہونے کا یقین تھا تو آپ نے پرسنل لا، میراث، اجتماعی معاملات اور شخصی وقومی نیز بین الاقوامی تعلقات کی تنظیم سے متعلق وسیع طور پر قانون سازی کیوں فرمائی؟

جہاں تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعہ مذکورہ دونوں آیات کے اضافے کی بات ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ جرأت وہ شخص کرسکتا ہے جس کو سرکار علیہ السلام نے صداقت کا پیکر قرار دیا ہو اور جس نے خود اپنے بارے میں فرمایا ہو:

"أي سماء تظلني واي ارض تقلني ان قلت في القرآن برأي"

کون سا آسمان مجھے سایے میں رکھے گا اور کون سی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی اگر میں قرآن میں اپنی رائے داخل کروں گا؟ (۱)

۵۔ مستشرقین قرآن کریم کی عظمت شان گھٹانے کے لئے ایک بے بنیاد بات یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کریم سابقہ آسمانی صحیفوں یعنی توریت وانجیل سے ماخوذ ہے، اس کے اکثر مواد انہیں صحیفوں سے لئے گئے ہیں، چنانچہ جارج سیل لکھتا ہے:

"مجھے یقین ہے کہ قرآن حکیم میں کوئی ایسی چیز نہیں جو محمد ﷺ نے ابتدا میں متعارف کرائی ہو، بلکہ قرآن مجید میں جو کچھ موجود ہے اس کو قدیم مصادر میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔" (۲)

منٹگمری واٹ نے لکھا ہے:

"قرآن کی ابتدائی آیات ظاہر کرتی ہیں کہ خدا کے خالق ہونے اور بعث بعد الموت اور یوم حساب کے نظریات کے لحاظ سے اسلام یہودی اور عیسائی نظام توحید سے مطابقت رکھتا ہے، بعد کی آیات میں قرآن کا بائبل کی روایات پر انحصار اور بھی واضح نظر آتا ہے، کیوں کہ ان آیات میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کے مواد کثرت سے موجود ہیں۔ (۳)

ایک جگہ اسی مستشرق نے اس سلسلے میں یہ خامہ فرسائی کی:

۱۔ قرآن کریم اور مستشرقین: ڈاکٹر الحبابی نقرہ، مشمولہ اسلام اور مستشرقین: ۶/۱۳۹: مطبع سابق۔

۲۔ دی قرآن: جارج سیل: ص: ۴۹، بحوالہ ضیاء النبی: ۶/۳۸۳: مطبع سابق۔

۳۔ محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس مین: ص: ۳۹: مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس: ۱۹۷۱ء۔

''اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بائبل کے نظریات کا علم (چند کہانیوں کو چھوڑ کر) مکہ کے ذہنی ماحول سے اخذ کیا تھا، یہ علم آپ نے کوئی کتاب پڑھ کر یا کسی مخصوص شخص کے ساتھ رابطہ کے ذریعہ حاصل نہیں کیا تھا، اس لئے ایک لحاظ سے اسلام کا تعلق یہودی اور عیسائی روایت کے ساتھ ہے کیوں کہ یہ دین اس ماحول سے ابھرا جس میں بائبل کے نظریات سموئے ہوئے تھے۔'' (۱)

مستشرقین میں یہ بھی مشہور ہے:

''قرآن میں جو کچھ جدید ہے وہ صحیح نہیں اور جو صحیح ہے وہ جدید نہیں۔'' (۲)

مستشرقین کی خدمت میں گزارش ہے کہ انھوں نے یہ اصول کہاں سے حاصل کیا ہے کہ سچ وہی ہوتا ہے جو نیا ہو یا دین وہی سچا ہوتا ہے جو اپنے سے پہلے انسانی معاشرہ میں موجود تمام عقائد، نظریات، روایات اور معمولات کو یکسر ملیا میٹ کر دے، اور پھر اس کے کھنڈروں پر عمارت تعمیر کرے، کیا اصلاحی تحریکیں وہی سچی ہوتی ہیں جو معاشرے کی ہر قدر کو صحت وسقم کی تمیز کے بغیر ملیا میٹ کر دیں، اور پھر نظریات، اخلاق، اقدار اور روایات کا وہ مجموعہ پیش کریں جس کی پہلے کہیں نظیر نہ ملتی ہو؟

چونکہ تمام انبیاے کرام حق کے علم بردار تھے، اس لئے ان کی تعلیمات اور ان کے پیغامات میں موافقت ایک قدرتی بات تھی، ہمارے ہاتھوں میں آج جو صحف سماویہ موجود ہیں، ان میں ہمیں جو باہم تضاد نظر آتا ہے وہ تضاد اس لئے نہیں کہ حضرت عیسیٰ وموسیٰ اور آقائے کریم علیہم السلام ایک دوسرے سے متضاد پیغام لے کر آئے بلکہ یہ تضاد اس وجہ سے ہے کہ یہود ونصاریٰ نے اپنے صحائف کو بازیچۂ اطفال بنائے رکھا ہے، اگر آج بھی اصل تورات، زبور اور انجیل مل جائیں تو ان تینوں کتابوں کی بنیادی تعلیمات اور قرآن حکیم کی بنیادی تعلیمات میں ذرا فرق نظر نہ آئے، اور تفصیلات میں اختلاف حکمت کے عین مطابق ہے۔ (۳)

۱۔ محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس مین، ص: ۴۱؛ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس: ۱۹۷۱ء۔

۲۔ ضیاء النبی: ۶/ ۳۸۳؛ مطبع سابق۔

۳۔ ضیاء النبی: ۶/ ۳۸۴؛ مطبع سابق۔

ہم مستشرقین سے پوچھتے ہیں کہ اگر انا جیل کی کوئی بات تورات کے مطابق نظر آئے تو کیا وہ اس بنا پر تورات کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کریں گے؟ اور اسے توریت سے نقل شدہ کتاب قرار دیں گے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ انجیل میں اگر ایسی باتیں موجود ہوں جو سابقہ کتابوں میں بھی نظر آتی ہیں تو اس سے انجیل کے کلام خداوندی ہونے پر کوئی حرف نہ آئے، اور اگر قرآن حکیم کی کوئی بات سابق صحف سماویہ میں بھی نظر آجائے تو اس کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کر کے اس کو سابقہ کتابوں کی نقل قرار دیا جائے؟(۱)

۱۔ضیاء النبی:۶/۳۸۵؛مطبع سابق۔

7

باب سوم

حدیث رسول اور مستشرقین

- عہد رسالت میں حفاظت حدیث
- عہد رسالت میں کتابت حدیث
- عہد نبوی میں حفظ حدیث
- عہد صحابہ میں کتابت حدیث
- عہد صحابہ میں حفظ حدیث
- عہد رسالت وعہد صحابہ میں عمل کے ذریعہ حفاظت حدیث
- عہد تابعین میں کتابت وحفظ حدیث
- عہد تابعین کا ایک عظیم کارنامہ
- کتب صحاح کی تدوین
- روایت حدیث میں صحابہ اورائمہ حدیث کا احتیاط

حدیث رسول ﷺ اور مستشرقین

اسلامی احکام کا سرچشمۂ ثانی حدیث رسول ﷺ ہے، اسلام دشمن مستشرقین نے جب قرآن حکیم سے مقابلہ آرائی میں منھ کی کھائی اور ہر محاذ پر انہیں ذلت ورسوائی کے سوا کچھ نہ مل سکا، تب بغض وعناد سے لبریز ان کی عقابی نگاہیں حدیث رسول پر مرکوز ہوگئیں، اور اس کے اوپر الزامات واعتراضات کی بوچھار کر ڈالی، ان کی یہ جدوجہد بہرحال اسلامی تشخص کو داغ دار کرنے اور اسلامی عقائد کی بنیادوں کو کمزور کرنے کی کوششوں میں اپنی نوعیت کی انوکھی کوشش تھی، کیوں کہ بہت سارے اسلامی اوامر ونواہی کا مبدأ استنباط یہی احادیث نبویہ ﷺ ہیں، اگر انہیں کو شک وتردد کا محور بنادیا جائے تو پھر اس سے ماخوذ مسائل کا حشر کیا ہوگا، اس کا آپ آسانی سے تصور کرسکتے ہیں۔

مسلمانوں کے نزدیک حدیث رسول ﷺ کی اہمیت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ بہت سارے مجمل قرآنی معانی ومفاہیم کا شارح وترجمان ہے، اگر حدیث کا مقدس ذخیرہ ہی شکوک وشبہات کے دائرہ میں آجائے تو بہت سارے قرآنی احکام پردۂ خفا میں ہی رہ کر تشنۂ توضیح رہ جائیں گے، نتیجۃً نزولِ قرآن کے مقاصد کی تکمیل کا خواب ادھورا ہوکر رہ جائے گا۔

مستشرقین نے احادیث کی طرف الزامات کی جو بوچھار کی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کے بعد مسلمانوں کا سب سے زیادہ اعتماد ویقین حدیث رسول ﷺ ہی پر ہے، نیز حدیث رسول ﷺ ہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر شمع رسالت کے پروانے

اس عہد میمون میں پہونچ سکتے ہیں جس میں وہ اپنے رسول کے دہن پاک سے نکلنے والی صدائے دلنواز سے شادکام ہوسکتے ہیں، اور آپ اور آپ کے صحابہ کرام کی صبح وشام کی جلوہ آرائیوں کا نظارہ کرسکتے ہیں، ان کے کردار وگفتار کو ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، اگر اس کو اعتراضات والزامات کے ذریعہ ناقابل یقین بنادیا جائے تو پھر مذکورہ سعادتوں کی حصولیابی کا یہ واحد ذریعہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔

حدیث کے تعلق سے پہلے چند مستشرقین کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔

ڈاکٹر محمود حمدی زقزوق اپنی کتاب 'الاستشراق والخلفیة الفکریة للصراع الحضاری' میں لکھتے ہیں:

"گولڈزیہر احادیث نبوی کا بہت بڑا عالم تھا، اس نے اپنی کتاب 'دراسات محمدیہ' کے دوسرے حصے میں حدیث کے ارتقا پر بڑی عمیق بحث کی ہے، حدیث کے متعلق اسے جو گہری معلومات اور بے مثال ملکہ تھا اس کی بنا پر اس نے حدیث کے خارجی اور داخلی ارتقا پر ہر پہلو سے بحث کی ہے، حدیث کے موضوع پر مسلسل اور عمیق تحقیق نے اس کے دل میں حدیث کے متعلق شکوک پیدا کردیئے اور احادیث پر اس کا اعتماد ختم ہوگیا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ گولڈزیہر احادیث پاک کو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اسلام کے دینی، تاریخی اور اجتماعی ارتقا کا نتیجہ قرار دیتا ہے، لہٰذا گولڈزیہر کے نقطۂ نگاہ سے حدیث کو اسلام کے دور اول یعنی عہد طفولیت کی تاریخ کے لئے قابلِ اعتماد دستاویز نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ حدیث ان کوششوں کا نتیجہ ہے جو اسلام کے دور عروج میں اسلام کے ارتقا کے لئے کی گئیں، گولڈزیہر اس بات پر بڑے پرزور دلائل پیش کرتا ہے کہ اسلام متحارب قوتوں کے درمیان ارتقائی منازل طے کرتا ہوا منظم شکل میں نمودار ہوا، وہ حدیث کے تدریجی ارتقا کی بھی تصویر کشی کرتا ہے اور ناقابل تردید دلائل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ حدیث کس طرح اپنے زمانے کی روح کا عکس تھی، اور کس طرح مختلف نسلوں نے احادیث کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کیا، اور کس طرح اسلام کے مختلف گروہ اور فرقے اپنے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے موسس اسلام کا سہارا لیتے تھے، اور کس طرح انہوں نے ایسی باتوں کو اپنے رسول کی طرف

منسوب کیا جو ان کے موقف کی حمایت کرتی تھیں۔"(۱)

یہی گولڈزیہر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سیاسی مسائل سے نمٹنے کا ایک ذریعہ قرار دیتے ہوئے اسے اموی خلفا اور ان کے ریزہ خوار علما کے ذریعہ وضع کردہ فن قرار دیتا ہے، چنانچہ علامہ پیر کرم شاہ ازہری اس سلسلے میں گولڈزیہر کے خیالات نقل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اس طرح اموی دور میں جب امویوں اور علمائے صالحین کے درمیان نزاع نے شدت اختیار کی تو احادیث گڑھنے کا کام ہیبت ناک سرعت سے مکمل ہوا، فسق وارتداد سے مقابلہ کرنے کے لئے علما نے ایسی احادیث گڑھنی شروع کردیں جو اس مقصد میں ان کی مدد کرسکتی تھیں، اس زمانے میں اموی حکومت نے بھی علما کے مقابلے میں یہ کام شروع کردیا، وہ خود بھی احادیث گڑھتی اور لوگوں کو بھی ایسی احادیث گڑھنے کی دعوت دیتی، جو حکومتی نقطہ نظر کے موافق ہوں، حکومت نے بعض ایسے علما کی پشت پناہی بھی کی جو احادیث گڑھنے میں حکومت کا ساتھ دیتے تھے، احادیث گڑھنے کا معاملہ سیاسی مسائل تک محدود نہ رہا، بلکہ یہ آگے بڑھ کر دینی معاملات اور عبادات میں بھی داخل ہوگیا، اور کسی شہر کے لوگ جن باتوں کو اپنے خیال کے مطابق نہیں سمجھتے تھے، ان کے خلاف حدیثیں گڑھ لیتے تھے، احادیث گڑھنے کا یہ کام دوسری صدی ہجری میں بھی جاری رہا۔"(۲)

آرتھر جیفری اپنی کتاب "اسلام محمد اینڈ ہز ریلیجن" میں لکھتا ہے:

"تاہم پیغمبر کے انتقال کے بعد ان کے پیروکار کی بڑھتی ہوئی جماعت نے محسوس کیا کہ مذہبی اور معاشرتی زندگی میں بے شمار ایسے مسائل ابھر رہے ہیں جن کے متعلق قرآن میں کوئی رہنمائی موجود نہیں ہے، لہٰذا ایسے مسائل کے متعلق رہنمائی حدیث میں تلاش کی گئی جزوی طور پر صحیح اور جعلی احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ حدیث کی کتابوں میں جمع کردیا گیا، حدیث کے چھ مجموعوں کو مستند تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ کتب صحاح میں زیادہ تر حدیثیں ایسی تھیں جن کا تعلق فقہی مسائل سے تھا اس لئے اکثر دیگر مذہبی اہمیت کے معاملات کے لئے

۱۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری، ص: ۱۲۳، مطبوعہ دار المنار، قاہرہ: ۱۹۸۹ء۔

۲۔ ضیاء النبی: ۱۹/۷، مطبع سابق۔

غیر مستند مجموعوں کی احادیث پر اعتماد کرنا ضروری تھا، اس بات کا مسلمانوں کو اچھی طرح علم تھا کہ حدیث کا اکثر مواد جعلی ہے، لیکن اسلام کے مطالعہ کے لئے ان احادیث کی بھی اہمیت تھی جو مسلمانوں نے خود گڑھی تھیں، اور انہیں محمد ﷺ کی طرف منسوب کر دیا، بلکہ ایسی موضوع احادیث کو بعض اوقات ان احادیث جیسی اہمیت دی جاتی ہے، جو سچ مچ پیغمبر سے منقول ہیں۔"(۱)

ول ڈیوران اپنی کتاب "ایج آف فیتھ" میں لکھتا ہے:

"بہت ساری احادیث نے مذہب اسلام کو ایک نیا رنگ دے دیا، محمد ﷺ نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کے پاس معجزات دکھانے کی قوت ہے، لیکن سیکڑوں حدیثیں ان کے معجزانہ کارناموں کا پتہ دیتی ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اکثر احادیث عیسائی تعلیمات کے زیر اثر تشکیل پذیر ہوئیں، دشمن کے ساتھ محبت کی تعلیم دی گئی، حالانکہ محمد ﷺ کا موقف سخت تر تھا، خدا کے حضور دعا کا تصور بائبل سے لیا گیا، اور انگور کے کھیت کے مزدوروں کی باتیں بائبل کی نقل میں محمد ﷺ کی زبان سے ادا کروائی گئیں۔"(۲)

تقریباً یہی باتیں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے پروفیسر گب کے حوالے سے نقل کی ہیں، چنانچہ اپنے مقالہ 'سر ہیملٹن الیگزنڈر روسکین گب' میں لکھتے ہیں کہ:

"وہ (گب) اپنے قاری کو حسن بیان اور اپنے مخصوص استدلال سے مسحور کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری ختم ہوتے ہوتے چونکہ قانون اور اس کے نفاذ کا پر پیچ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، اور صورتحال یہ تھی کہ خلافت کے مختلف شہروں اور صوبوں میں مقامی علما اپنی اپنی فہم کے مطابق آزادانہ رائے دیتے تھے، جو بسا اوقات باہم مختلف اور متضاد ہوتی تھیں، اور اس پر مستزاد تھیں عرف وعادت اور انتظامی ضوابط سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں، اس لئے مذہبی رہنماؤں نے اس صورتحال کو خطرناک سمجھا، خاص طور پر جب مقامی قوانین قرآن کے اخلاقی اصولوں سے متصادم ہوتے ہیں، اس مسئلہ کا حل انہوں نے یہ ڈھونڈھا کہ پیغمبر اسلام کے معاصرین کے واسطہ سے احادیث بیان کرنی شروع کر دیں،

۱۔ اسلام، محمد اینڈ ہز ریلیجن، ص: ۱۲۔

۲۔ ایج آف فیتھ، ص: ۲۱۲، ۲۱۱، مطبوعہ نیویارک: ۱۹۵۰ء۔

اور پھر یہ کہا کہ ان احادیث کی پابندی ضروری ہے اور یہ کہ ان کی حیثیت آیات قرآن سے بمشکل ہی کمتر قرار دی جاسکتی ہے، اسی سلسلے میں آگے چل کر جہاں وہ (گب) حدیث اور علم حدیث کی تدوین کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اسے علماے حدیث کی مصنوعی تخلیق سے تعبیر کرتے ہیں۔''(۱)

مذکورہ بالا اقتباسات سے چند امور معلوم ہوئے۔

(۱) تقریباً تمام مستشرقین اس نقطے پر متحد ہیں کہ حدیث کی حفاظت وصیانت کا کام عہد نبوی کے بعد شروع ہوا۔

(۲) رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر کا نام حدیث نہیں ہے، بلکہ حدیث ان اصول وقوانین کا نام ہے جنہیں پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد پیدا شدہ مسائل سے نپٹنے کے لئے گڑھا گیا۔

(۳) تخلیق حدیث کا داعیہ اور حفاظت تدوین حدیث کا محرک دراصل وہ پیچیدگیاں تھیں جو اسلامی سلطنت کے حدود کی وسعت سے پیدا ہوئی تھیں۔

(۴) حدیث کو اسلامی خلفا بالخصوص ابتدائی عہد کے اموی سلاطین نے اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے اور اپنے لئے رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے علما سے حدیثیں گڑھوائیں۔

(۵) دینی مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف ومتحارب گروہوں نے اپنی تائید اور فریق مخالف کی تردید کے لئے احادیث وضع کیں۔

(۶) وہ احادیث جن سے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی معجزانہ عظمت کا اظہار ہوا انہیں خوش عقیدہ مسلمانوں نے بعد میں گڑھا۔

(۷) وہ احادیث جن میں یہودیت وعیسائیت سے ملتی جلتی کوئی بھی تعلیم موجود ہے ان سب کو بعد کے مسلمانوں نے بائبل وغیرہ سے اخذ کی ہیں۔

ان سارے غلط مفروضوں کی تردید کا واحد راستہ یہ ہے کہ پہلے ہم قارئین کے سامنے حدیث کی حفاظت وصیانت اور اس کی تدوین کی مختصر سی تاریخ پیش کردیں، جس سے

۱۔ اسلام اور مستشرقین: ۲/۶۶،۶۵، مطبع سابق۔

یہ بات خود بخود ثابت ہو جائے گی کہ حدیث کی حفاظت و صیانت کا اہتمام مسلمانوں نے عہد رسالت ہی سے شروع کر دی تھی، جس کا داعیہ صرف اور صرف دارین کی سعادتوں کا حصول تھا، اس کے پیچھے کوئی دنیاوی مقصد کارفرما نہ تھا، نہ ہی حدیث کی طرف مسلمانوں کی توجہ کا محرک وہ مسائل اور پیچیدگیاں تھیں جو اسلامی سلطنت کی وسعت سے پیدا ہوئی تھیں، یوں ہی وہ احادیث جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معجزانہ عظمت شان کا اظہار ہوتا ہے، عہد رسالت ہی میں مشہور و معروف تھیں نہ کہ انہیں بعد میں آپ کی عظمت کے اظہار کی خاطر گڑھا گیا۔

❀❀❀

عہد رسالت میں حفاظت حدیث

عہد نبوی میں کسی بھی امر مہتم بالشان کی حفاظت کے تین ہی طریقے معروف تھے، حفظ، کتابت، اور اس پر مسلسل عمل، ان میں سے ہر ایک یادداشت کا ایک مستقل ذریعہ ہے، اور اگر کسی چیز کی حفاظت وصیانت میں یہ تینوں ذرائع بروئے کار لائے جائیں تو پھر اس میں کسی ہیر پھیر یا رد و بدل کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔

حدیث کی حفاظت وصیانت کی ابتدا عہد رسالت ہی سے ہو چکی تھی، اس پر بے شمار دلائل موجود ہیں، شمع نبوت کے پروانوں نے حفاظت حدیث میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، چنانچہ اس کام کے لئے انہوں نے مذکورہ تینوں ذرائع کا استعمال کیا، اس اجمال کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

عہد رسالت میں کتابت حدیث:

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے سیکڑوں احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا جس کا نام "صحیفۂ صادقہ" تھا، اس میں بہت ساری حدیثیں مکتوب تھیں۔

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی احادیث لکھوائی تھیں، یہ ذخیرہ ان کے صاحبزادے کے پاس تھا۔

(۳) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ایک کتاب میں احادیث کو جمع فرمایا تھا، جس کا نام ہی "کتاب سعد بن عبادہ" تھا، یہ کئی پشتوں تک ان کے خاندان میں رہا۔

(۴) حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے بھی ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔

(۵) احادیث کا ایک مجموعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا۔

(۶) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی دفتر کے دفتر احادیث لکھی یا لکھوائی تھیں۔

(۷) حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے بھی ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔

(۸) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: 'بینما نحن حول رسول اللہ نکتب' اس درمیان ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھ کر احادیث لکھا کرتے تھے۔ "نحن نکتب" سے اشارہ ملتا ہے کہ اس خدمت کو ایک جماعت انجام دیتی تھی اور اس کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے:

"کان عند رسول اللہ ﷺ ناس من اصحابه ,وانا معهم وانا اصغر القوم, فقال النبی ﷺ من كذب علی متعمدا فليتبوأ مقعده من النار, فلما خرج القوم قلت كيف تحدثون عن رسول الله ﷺ وقد سمعتم ما قال وأنتم تنهكون فی الحديث عن رسول الله ﷺ فضحكوا وقالوا يا ابن اخينا ان كل ما سمعنا منه عندنا فی كتاب" (۱)

خدمت اقدس میں کچھ صحابہ حاضر تھے، میں بھی تھا، میں سب سے کم عمر تھا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے، پھر جب لوگ باہر آئے تو میں نے ان سے کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا، وہ آپ لوگوں نے سنا، اس کے باوجود اتنی کثرت سے آپ لوگ کیسے حدیثیں بیان کرتے ہیں؟ وہ لوگ ہنسے اور کہا: اے بھتیجے جو کچھ ہم نے حضور سے سنا ہے وہ سب ہمارے پاس لکھا ہوا ہے۔

علاوہ ازیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے احکام و مسائل سے متعلق حدیثیں املا کرائیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے مسائل لکھوا کے بھجوائے۔ قبیلۂ جہینہ کے پاس مردہ جانوروں کے احکام لکھ کر بھجوائے۔

اخیر ایام میں کثیر احادیث کا ایک صحیفہ لکھوا کر عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں یمن بھجوایا تھا، مختلف قوانین واحکام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل کے پاس بھیجے، معاہدات کی تحریریں، نماز، روزہ، سود، شراب وغیرہ کے مسائل وائل بن حجر کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لکھوائے تھے۔ (۲)

۱۔ نزھۃ القاری شرح بخاری: ج:۱/ ۱۲، دائرۃ البرکات، گھوسی۔

۲۔ نزھۃ القاری شرح بخاری: ج:۱/ ۱۵، ۱۶، دائرۃ البرکات، گھوسی۔

عہد نبوی میں کتابت حدیث سے متعلق ایک شبہے کا ازالہ

عہد رسالت میں کتابت حدیث کے سلسلے میں کچھ لوگوں کو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے شبہہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لاتکتبوا عنی، من کتب عنی غیر القرآن فلیمحه" (۱)

میری کوئی بات نہ لکھا کرو، جس نے بھی لکھا ہو اسے مٹا دے۔

شبہہ یہ ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ممانعت کے سامنے کس کی جرأت ہوتی کہ وہ حدیث لکھتا، معلوم ہوا کہ عہد رسالت میں کتابت حدیث نہیں ہوتی تھی۔

اس حدیث کا جواب کئی طرح سے دیا گیا ہے:

اولاً: علما کو اس کی صحت میں کلام ہے، امام بخاری وغیرہ نے فرمایا کہ یہ درحقیقت حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے، یعنی ارشاد رسول نہیں ہے۔

ثانیاً: برتقدیر صحت علامہ ابن حجر نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں۔

(۱) یہ ممانعت نزول قرآن کے عہد کے ساتھ خاص ہے۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ حدیث اور قرآن دونوں کو ایک ہی چیز پر مت لکھو۔

(۳) ممانعت کا حکم مقدم ہے یعنی بالکل ابتدائی دور میں تھا، بعد میں جب قرآن کے ساتھ حدیث کے التباس کا خطرہ نہ رہا تو احادیث لکھنے کی اجازت دے دی گئی۔

علامہ محمد بن علوی مالکی حسنی فرماتے ہیں:

۱۔ مسلم شریف: ۲/۴۱۴۔

”والحق أنه لا تعارض، وقد اجتهد كثير من أهل العلم فی الجمع بينهما، وأحسن ما أراه فی ذالك هو القول بنسخ احاديث النهی عن الكتابة“(۱)

حق یہ ہے کہ کتابت حدیث کے حکم اور کتابت حدیث سے ممانعت والی دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اہل علم نے ان کے درمیان تطبیق کی بڑی کوشش کی ہے، میرے نزدیک اس سلسلہ میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ممانعت والی حدیث منسوخ ہے۔

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

”وان ذالك كان فی صدر الإسلام خشية وقوع اللبس بين القرآن والحديث“(۲)

کتابت حدیث کی ممانعت ابتدائے اسلام میں اس خوف کی بنا پر تھی کہ کہیں قرآن وحدیث خلط ملط نہ ہوجائیں۔

علامہ پیر کرم شاہ ازہری فرماتے ہیں:

”علمائے ملت اسلامیہ نے کتابت حدیث کی ممانعت اور جواز کے متعلق مروی احادیث میں تطبیق کی اور بھی کئی صورتیں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ ممانعت ان لوگوں کے لئے ہے جن کا حافظہ اچھا ہے، ان کو کتابت سے اس لئے منع کیا گیا تاکہ وہ کتابت پر بھروسہ کر کے احادیث کو حفظ کرنے میں سستی کا مظاہرہ نہ کریں، اور اجازت ان لوگوں کے لئے ہے جن کو اپنے حافظوں پر اعتبار نہ تھا، جیسے ابوشاہ، کہ ان کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث لکھنے کا خود حکم فرمایا۔“(۳)

یہ ساری تاویلیں اس لئے کرنے کی ضرورت پیش آئیں کہ سرکار ہی سے کتابت حدیث کی اجازت بھی مروی ہے، چنانچہ رافع بن خدیج سے مروی ہے کہ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم آپ سے کچھ چیزیں سنتے ہیں تو کیا ان کو لکھ لیا کریں؟ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۱۔ نزھۃ القاری: ۱ر۱۵-۱۶۔

۲۔ المنھل اللطیف فی اصول الحدیث الشریف: ص: ۱۹، بحوالہ جامع الاحادیث: ۱ر۱۶۵، مطبوعہ رضا اکیڈمی، ممبئی۔

۳۔ ضیاء النبی: ۷ر۱۱۷، مطبع سابق۔

نے فرمایا 'اکتبوا ولا حرج' لکھ لیا کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔(۱)

اگر مذکورہ تاویلات نہ کی جائیں تو پھر ممانعت اور اجازت والی احادیث میں تعارض کا وقوع ناگزیر ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ممانعت ابتداے اسلام میں تھی، بعد میں خود سرکار ہی نے کتابت حدیث کی اجازت دے دی، لہٰذا محض ممانعت والی حدیث دیکھ کر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ سرکار کے عہد میں کتابت حدیث ہوئی ہی نہیں۔

❁❁❁

۱۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ۴/۳۲۹ بحوالہ جامع الاحادیث: ۱/۱۶۹، مطبع سابق۔

عہد نبوی میں حفظ احادیث

اس امر کے اثبات کے بعد کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں کتابت کے ذریعہ حفاظت حدیث کا اہتمام کیا گیا، آیئے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بروئے کار لائے گئے حفاظت حدیث کے دوسرے اہم ذریعہ 'حفظ' کو بھی دیکھتے چلیں۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات زبان فیض ترجمان سے صادر فرماتے تو صحابہ کرام اسے بغور سنتے اور خود سرکار ہر بات کم از کم تین بار فرماتے تھے، چنانچہ بخاری شریف میں ہے:

"إنه كان إذا تكلم بكلمة اعادها ثلثاً حتى تفهم عنه"[1]

جب آپ کوئی بات کہتے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے یہاں تک کہ وہ سمجھ لی جاتی۔

حفظ حدیث کے تعلق سے صحابہ کرام کس قدر سنجیدہ تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس ترتیب سے مختلف اشیاء کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوتا، صحابہ کرام اسی ترتیب سے اپنے تلامذہ کو بھی یاد کراتے اور خود یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے، کسی لفظ کا رہ جانا تو بڑی بات ہے، اگر کسی سے تقدیم وتاخیر ہو جاتی اور ترتیب بگڑ جاتی تو اس پر تنبیہ فرماتے تھے، چنانچہ اس سلسلے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ آپ کے سامنے کسی نے ان کی روایت کردہ حدیث 'بنی الإسلام علی خمس الخ' یوں پڑھا۔ "الحج وصیام رمضان" یعنی حج کو صیام پر مقدم کر کے پڑھا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ٹوک دیا اور فرمایا "لا! صیام رمضان والحج" یوں نہیں، صیام رمضان پہلے اور حج بعد میں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس اہتمام سے یاد رکھتے تھے کہ الفاظ کی تقدیم وتاخیر بھی حافظے میں محفوظ رہتی، اور دوسروں کو اسی ترتیب سے یاد رکھنے کی ترغیب دیتے، حالانکہ اس واقعہ میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر سے معنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مگر

---

[1] بخاری شریف: ۱/ ۲۰، باب من اعاد الحدیث ثلثاً۔

ارشادات رسول ﷺ کی ترتیب بدل جاتی، یہ بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو گوارا نہ ہوا، تو پھر اس کی کہاں گنجائش کہ وہ رسول پر جھوٹ باندھیں۔(۱)

پھر یہ بھی نہیں کہ ایک دفعہ سن لیا پھر اس کو یاد رکھنے کی کوشش نہیں کی، یا اس پر کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ صحابۂ کرام کی عادت کریمہ تھی کہ ارشادات رسول سننے کے بعد اسے اچھی طرح حفظ کرتے، پھر بار بار اس کا دور کرتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سنتے تھے، جب حضور مجلس سے تشریف لے جاتے تو ہم لوگ آپس میں اس کا دور کرتے، ایک دفعہ ایک شخص کل حدیثیں بیان کر جاتا، سب سنتے، پھر دوسرا، پھر تیسرا، کبھی کبھی ساٹھ ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے اور سب باری باری سناتے، جب ہم اٹھتے تو ہمیں حدیثیں اس طرح یاد ہوتیں گویا ہمارے دلوں میں بو دی گئی ہیں۔(۲)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنا چشم دید حال بیان کرتے ہیں کہ فرض نمازوں کے بعد صحابۂ کرام مسجد نبوی میں بیٹھ کر قرآن وحدیث کا مذاکرہ کرتے۔(۳)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام کہیں بیٹھتے تو ان کی مجلس کا موضوع یا تو احادیث ہوتیں یا قرآن کا پڑھنا اور سننا ہوتا، اس کے باوجود کسی صاحب کا حافظہ اس بوجھ کو برداشت نہ کرتا تو خدمت اقدس میں حاضر ہو کر شکایت کرتے، اور حضور ﷺ ان کے حافظے کو اتنا قوی بنا دیتے کہ پھر وہ کوئی بات بھول نہ پاتے، جب کہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کا واقعہ مشہور و معروف ہے۔

مذکورہ بالا چند واقعات حفظ حدیث کے سلسلے میں صحابۂ کرام کی کوششوں کی بھرپور عکاسی ہو رہی ہے، مزید اور بھی مثالیں تاریخ کے صفحات کی امانت ہیں، طوالت کے خوف سے ہم اتنے پر ہی اکتفا کر رہے ہیں۔

۱۔ نزھۃ القاری: ۱/ ۲۱، ۲۲، مطبع سابق۔

۲۔ مجمع الزوائد: ۱/ ۱۶۱؛ بحوالہ نزھۃ القاری: ۱/ ۲۳، مطبع سابق۔

۳۔ المستدرک للحاکم: ۱/ ۹۴۔

عہد صحابہ میں کتابت حدیث

عہد نبوی میں حفاظت حدیث کے دو معتمد ذرائع حفظ اور کتابت کا بیان ہو چکا، تیسرے ذریعہ عمل بالحدیث کا بیان ہم بعد میں کریں گے، آیئے عہد صحابہ میں کتابت حدیث کا حال ملاحظہ کرتے چلیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جن کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ کتابت حدیث کے سخت مخالف تھے، فرماتے ہیں، "قیدوا العلم بالکتابۃ" علم لکھ کر مقید کرلو۔(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے محمود بن ربیع سے حضرت عتبان کی ایک طویل حدیث سنی تو اپنے صاحبزادے کو حکم دیا کہ اسے لکھ لو، صاحبزادے نے حکم کی تعمیل کی۔

حضرت ابان مشہور تابعی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ساگوان کی تختیوں پر حدیثیں لکھا کرتے تھے۔(۲)

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے جو احادیث سنتا لکھ لیتا، آپ ہی کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثیں لکھا کرتے تھے، کاغذ بھر جاتا تو کسی اور چیز پر لکھتے۔(۳)

صحابۂ کرام کی طرف منسوب احادیث کے مجموعے جنہیں ان کے تلامذہ نے جمع کیا وہ اس پر شاہد عدل ہیں کہ دور صحابہ وتابعین میں حدیث کی تدوین وکتابت موجود تھی، چنانچہ اس سلسلہ میں چند مجموعے یہ ہیں۔

۱۔ مسند دارمی: ۱/ ۴۳۷: دار المغنی للنشر والتوزیع، ریاض۔

۲۔ مسند دارمی: ۱/ ۴۳۳: دار المغنی للنشر والتوزیع، ریاض۔

۳۔ مسند دارمی: ۱/ ۴۳۹: دار المغنی للنشر والتوزیع، ریاض، طحاوی: ۲/ ۳۸۴۔

(ا) حضرت ابو ہریرہ کی طرف تین مجموعے منسوب ہیں، بشیر بن نھیک کا مجموعہ، حسن بن عمرو بن امیہ کا مجموعہ اور ہمام بن منبہ کا مجموعہ، آخر الذکر مجموعہ سب سے زیادہ شہرت کا حامل ہے۔(۱)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی طرف بھی کئی مجموعے منسوب ہیں، جن میں سے ایک مجموعہ اسماعیل بن عبدالکریم کے پاس تھا۔(۲)

دوسرا سلیمان یشکری کے پاس تھا۔(۳)

ایک صحیفہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس تھا، اس صحیفے کے بارے میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے کہ "مجھے سورۂ بقرہ کے مقابلہ میں صحیفۂ جابر زیادہ حفظ ہے۔"(۴)

علاوہ ازیں اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا صحیفہ صادقہ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا صحیفہ، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحیفہ خاص طور پر مشہور ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مرویات کو خاص طور پر نافع نے جمع کیا، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کو عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے لکھ لیا تھا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی احادیث کو قتادہ نے لکھ لیا تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مرویات کو ان کے تلمیذ حضرت کریب نے لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔(۵)

۱۔ جامع الاحادیث: ۱۷۴/۱، امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی شریف۔

۲۔ شرح معانی الآثار: ۳۰۴/۲۔

۳۔ تہذیب التہذیب: ۲۰۶/۲۔

۴۔ جامع الاحادیث: ۱۷۶/۱، مطبع سابق۔

۵۔ نزھۃ القاری: ۱۶،۱۷/۱، مطبع سابق۔

عہد صحابہ میں حفظ حدیث

حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا:
”حدیثوں کا آپس میں مذاکرہ کرتے رہنا، دور کرتے رہنا، بار بار دہراتے رہنا اور ذہن میں حاضر رکھنا اگر ایسا نہ کرو گے تو جاتی رہیں گی۔“

حضرت علی ؓ اپنے اصحاب سے فرماتے: ”احادیث ایک دوسرے سے بیان کرتے رہو، اگر ایسا نہ کرو گے تو چلی جائیں گی۔“(۱)

ایک مرتبہ حضرت ابن مسعود ؓ نے اپنے تلامذہ سے پوچھا کہ تم لوگ آپس میں بیٹھ کر احادیث سنتے سناتے بھی ہو یا نہیں؟ تلامذہ نے جواب دیا جی ہاں ہم لوگ ایسا کرتے ہیں، اگر ہمارا کوئی ساتھی حاضر نہ ہو تو اگر کوفے کے آخری سرے پر ہوتا تو وہیں جا کر اس سے ملتے۔(۲)

حضرت ابو سعید خزامی ؓ بھی آپس میں دور احادیث کرتے تھے، بلکہ ان کی تاکید یہ بھی تھی کہ احادیث بلفظہ یاد کی جائیں۔(۳)

حضرت ابو ہریرہ ؓ جن سے ۵۳۷۲ احادیث مروی ہیں، ایک دن مروان بن الحکم نے آپ کو بلا بھیجا، مروان کے سکریٹری ابو الزعزعہ کا بیان ہے کہ مجھے پہلے ہی سے حکم مل چکا تھا کہ میں پردہ کے پیچھے بیٹھ کر جو کچھ وہ بیان کریں میں لکھتا جاؤں، بہر حال یہی ہوا، مروان مختلف انداز سے سوالات کرتے، اور حضرت ابو ہریرہ ؓ احادیث کریمہ بیان

۱۔ المستدرک للحاکم: ۱/ ۹۵۔

۲۔ داری، ص: ۷۹۔

۳۔ المستدرک للحاکم: ۱/ ۹۳۔

کرتے جاتے، اور میں پس پردہ لکھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار ہو گیا، اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ چلے گئے، اور وہ مجموعہ بحفاظت رکھ دیا گیا، ابوالزعزہ بیان فرماتے ہیں کہ:

"فتركه سنة ،ثم ارسله إليه، وأجلسني وراء الستر، فجعل يسأله وأنا أنظر في الكتاب فما زاد ولا نقص"[1]

ایک سال کے بعد پھر مروان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا، اور مجھے پردہ کے پیچھے بٹھا کر ان سے سوالات کرنے لگا اور میں کتاب میں دیکھتا جاتا، تو نہ تو میں نے کوئی زیادتی دیکھی نہ ہی کمی۔

عہد صحابہ میں حفظ حدیث کے شاندار اہتمام کو ظاہر کرنے کے لئے یہی ایک مثال کافی ہے۔

۱۔ جامع الاحادیث: ۱/۱۸۶: مطبع سابق۔

عہد رسالت وعہد صحابہ میں عمل کے ذریعہ حفاظت حدیث

صحابہ کرام رحمت عالم ﷺ کے اقوال وافعال پر کس طرح عمل کرنے کی کوشش کرتے، اس سلسلے میں علامہ پیر کرم شاہ ازہری کا یہ بیان قابل دید ہے:

”ان کے دل کے ان لطیف احساسات سے لے کر جنہیں پابند الفاظ نہیں کیا جاسکتا ان کی طبعی خواہشات تک سب کے سب سنت مصطفوی ﷺ کے پابند تھے، ان کی خلوتوں کا سوز وگداز، اور ان کی جلوتوں کے خروش عمل، ان کی شب بیداریاں اور ان کے قیلولے، سب فرمان نبوی کے تابع تھے، اور جو قول فعل سے ہر وقت ہمکنار رہے، وہ کیسے فراموش ہوسکتا ہے؟ اور وہ فرمان جس کے متعلق یقین ہو کہ اس کی تعمیل میں ہماری فلاح دارین ہے، اس کی یاد کے نقوش کیسے دھندلے پڑ سکتے ہیں؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جو عشق تھا محبوب خدا سے، جو جنون تھا اس کے ہر ارشاد کی تعمیل کا، جو سودا تھا حصول علم کا، جو جذبہ تھا تبلیغ دین قیم کا، اس کے پیش نظر ایک اجنبی بھی پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کا ایک فرمان بھی فراموش نہ ہونے دیا ہوگا۔

ان کا اتباع رسول ﷺ عبادات تک محدود نہ رہتا، بلکہ انہوں نے اپنے محبوب اور اپنے رب کے حبیب ﷺ کی ہر عادت اور ہر ادا کو اپنانے کی کوشش کی، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خواہش ہوتی کہ ان کی نشست وبرخاست، ان کی گفتار، ان کا کردار، ان کا سونا اور جاگنا، اور ان کا کھانا پینا، سب حضور ﷺ کے نمونے کے مطابق ہو، اگر کسی نے حضور ﷺ کو کھلا دیکھا تو اس نے اپنے حبیب کی اس ادا کو اپنانا ہی اپنے لئے

باعث سعادت سمجھا، اگر کسی نے حضور ﷺ کو کسی بات کے بعد مسکراتے دیکھا، تو اس نے اپنے اوپر لازم کرلیا کہ وہ بھی اس بات کے بعد اپنے حبیب کی اتباع میں مسکرائے گا۔"(۱)

صحابہ کرام کے عمل بالحدیث کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت میسرہ بن یعقوب الطہوی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کھڑے ہوکر پانی پیتے دیکھا تو عرض کیا کہ آپ کھڑے ہوکر پانی پی رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر میں کھڑے ہوکر پانی پیوں تو بھی ٹھیک ہے، کیونکہ میں نے حضور کو کھڑے ہوکر پانی پیتے دیکھا ہے، اور اگر میں بیٹھ کر پانی پیوں تو بھی ٹھیک ہے کیوں کہ میں نے حضور کو بیٹھ کر پانی پیتے دیکھا ہے۔(۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کا ارشاد ہے:

"كنت أرى أن باطن القدمين احق بالمسح من ظاهرهما، حتى رأيت رسول الله ﷺ يمسح ظاهرهما۔"(۳)

میرے خیال میں قدم کے باطنی حصے مسح کے زیادہ کے لائق تھے قدم کے باطنی حصوں کی بہ نسبت، یہاں تک کہ میں نے سرکار ﷺ کو ظاہر قدم پر مسح کرتے ہوئے دیکھا (تو اپنی رائے بدل لی)

حضرت علی بن ربیعہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سواری کے لئے ایک جانور حاضر کیا گیا، آپ نے رکاب میں پاؤں رکھا تو پڑھا "بسم اللہ" جب آپ چوپائے پر سیدھے بیٹھ گئے تو پڑھا "سبحان الذی سخر لنا هذا وما كنا له مقرنين وإنا إلى ربنا لمنقلبون" پھر تین مرتبہ "الحمد للہ" پڑھا اور تین مرتبہ تکبیر کہی اور پھر یہ کلمات پڑھے "سبحانك لا إله إلا أنت، قد ظلمت ظلمي نفسي فاغفرلي" اس کے بعد آپ مسکرائے، تو میں نے عرض کیا! امیر المؤمنین! آپ کے مسکرانے کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے حضور کو وہ کام کرتے دیکھا ہے جو کام میں نے ابھی کیا ہے، حضور ﷺ اس

۱۔ ضیاء النبی: ۷/۸۷، مطبع سابق۔

۲۔ ضیاء النبی: ۷/۹۱، مطبع سابق۔

۳۔ السنۃ قبل التدوین، ص: ۸۴، دار الفکر بیروت: ۱۹۸۰ء۔

کے بعد مسکرائے تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ مسکرانے کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا! بندہ جب "رب اغفرلی" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے، اور فرماتا ہے کہ میرے بندے کو یقین ہے کہ میرے بغیر کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔(۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جو چیز حضور ﷺ سے سنتے یا آپ کے جس عمل کو دیکھتے وہ خود بھی ہو بہو اس کے مطابق عمل کرتے، نہ ذرہ برابر کمی کرتے اور نہ ذرہ برابر اضافہ کرتے۔(۲)

حضرت مجاہد بیان فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے، دورانِ سفر آپ راستے سے ذرا ہٹ گئے، ہم نے عرض کیا کہ آپ نے اس طرح کیوں کیا؟ تو فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک درخت کے پاس جب بھی جاتے، اس کے نیچے قیلولہ فرماتے اور لوگوں کو بتاتے کہ حضور ﷺ بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔

آپ ہی سے عرض کیا گیا کہ صلوۃ سفر کا ذکر ہمیں قرآن میں نہیں ملتا، آپ نے فرمایا:

"إن الله عزوجل بعث إلينا محمداً ﷺ ولا نعلم شيئاً فإنما نفعل كما رأينا محمداً ﷺ يفعل"(۳)

اللہ عزوجل نے محمد ﷺ کو ہماری طرف مبعوث فرمایا جب کہ ہم کچھ نہیں جانتے تھے، تو ہم ویسا ہی کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے سرکار ﷺ کو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے پاس ان کا بھتیجا بیٹھا ہوا تھا، اس نے ایک کنکر اپنی انگلی میں رکھ کر پھینکا، حضرت بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اسے منع کیا اور فرمایا حضور ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس طرح کنکریاں پھینکنے سے نہ تو تم کسی جانور کا شکار کر سکتے ہو اور نہ ہی کسی دشمن کو مار سکتے ہو، یہ یا تو کسی کا دانت توڑے گی یا کسی کی آنکھ نکال دے گی، حضور ﷺ کا ارشاد سننے کے باوجود ابن مغفل کا بھتیجا کنکریاں

۱۔ السنۃ قبل التدوین، ص: ۸۴، ۸۵، دار الفکر بیروت: ۱۹۸۰ء۔

۲۔ السنۃ قبل التدوین، ص: ۸۵، دار الفکر، بیروت: ۱۹۸۰ء۔

۳۔ السنۃ قبل التدوین، ص: ۸۷، دار الفکر، بیروت: ۱۹۸۰ء۔

پھینکنے سے باز نہ آیا تو آپ نے فرمایا، میں تمہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنا رہا ہوں، کہ آپ نے اس کام سے منع فرمایا ہے، اس کے باوجود تم دوبارہ کنکریاں پھینک رہے ہو، میں کبھی تمہارے ساتھ بات نہیں کروں گا۔(۱)

فتح مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ پر مسلمانوں کی قوت وشوکت ظاہر کرنے کے لئے مسلمانوں کا حکم دیا کہ وہ اپنے کندھوں کو کھلا رکھیں، اور طواف میں رمل کریں، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو قوت وشوکت عطا کردی تو کندھے کھولنے اور رمل کرنے کا سبب ختم ہوگیا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"فیم الرملان الآن، والکشف عن المناکب، وقد أطأ الله الأسلام، ونفی الکفر وأهله ومع ذالك لاندع شیئا کنا نفعله علی عهد رسول الله ﷺ"(۲)

اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو شوکت دی، اور کفر واہل کفر کو ختم کردیا تو اب رمل کرنے اور کندھا کھولنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، پھر بھی ہم کسی ایسی چیز کو چھوڑیں گے نہیں جسے عہد رسالت میں کیا کرتے تھے۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی سچی عقیدت کی واضح دلیل ہے۔ فرماتے ہیں:

"لست تارکا شیئاً کان رسول الله ﷺ یعمل به إلا عملته"(۳)

یعنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی بھی عمل کو ترک کرنے والا نہیں ہوں۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا مشورہ دیا تو آپ کا پہلا جواب یہی تھا:

"کیف أفعل شیئاً لم یفعله رسول الله ﷺ"(۴)

۱۔ السنۃ قبل التدوین، ص: ۸۷۔۸۸، دار الفکر، بیروت: ۱۹۸۰ء۔

۲۔ السنۃ قبل التدوین، ص: ۸۶۔۸۷، دار الفکر، بیروت: ۱۹۸۰ء۔

۳۔ فیوض الباری: ۱/۱۷، ۱۸، مکتبہ رضوان، لاہور۔

۴۔ فیوض الباری: ۱/۱۷، مکتبہ رضوان، لاہور۔

میں ایسا کام کیسے کرسکتا ہوں جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہے؟

وہ صحابہ کرام جن کے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا معیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کرنا یا نہ کرنا ہو، جن کو اپنے محبوب کے ذریعہ طے کردہ خطوط سے سرمو انحراف گوارا نہ ہو، جن کا سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا غرض کہ ہر عمل سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھلا ہو، جو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر اپنے قریبی رشتہ داروں سے بات کرنا ترک کردیں، اور جن کی نگاہوں میں اپنے محبوب کی ایک ایک ادا کے نقوش ثبت ہوں، بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ان سے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی گوشہ چھوٹ گیا ہو؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ذہن سے محو ہو؟ یا کوئی حدیث یاد کر کے بھلا دیا ہو؟

عہد تابعین میں کتابت حدیث

عہد نبوی اور عصر صحابہ میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے جو کام ہوا تھا وہ باضابطہ نہیں تھا، جس صحابی نے جو حدیث سنی جہاں مناسب سمجھا لکھ لیا، صحابہ کرام کی طرف منسوب یا غیر منسوب جو صحائف تھے ان میں کوئی ترتیب وتہذیب نہ تھی۔

عہد تابعین کو حفاظت حدیث کا زرّیں دور کہا جاتا ہے، اس لئے کہ یہی وہ دور ہے جس میں مسلمانوں کو باضابطہ حدیث کی ترتیب وتدوین کا خیال ہوا، چنانچہ اس عہد کے خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے ملت اسلامیہ کے ممتاز افراد کو حدیث کی ترتیب وتدوین اور ان کے لکھنے کا حکم دیا جن میں ابوبکر بن حزم قاضئ مدینہ، قاسم بن محمد بن ابوبکر، ابوبکر محمد بن مسلم المعروف با بن شہاب زہری اور سعد بن ابراہیم کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

صالح بن کیسان کہتے ہیں کہ میرا اور زہری کا زمانہ طالب علمی میں ساتھ تھا، زہری نے مجھ سے کہا آؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں لکھیں، چنانچہ ہم دونوں نے حدیثیں لکھیں۔(۱)

معمر نے کہا کہ امام زہری کی لکھی ہوئی احادیث کے ذخیرہ کئی اونٹوں پر لادے گئے، آپ کی تصنیفات کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ جب ولید بن یزید کے قتل کے بعد روایات واحادیث کے صحائف ولید کے کتب خانے سے منتقل کئے گئے، تو صرف امام زہری کی مرویات وتصانیف گھوڑوں، گدھوں پر لاد کر لائی گئیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کے والد جو مصر کے گورنر تھے، انہوں نے حضرت کثیر بن مرہ کو احادیث لکھنے کے متعلق لکھا، چنانچہ حضرت لیث بن مسعود کا بیان ہے کہ:

۱۔ کنز العمال: ۵/۲۳۸۔

”حدثني يزيد بن ابي حبيب أن عبدالعزيز بن مروان كتب إلى كثير بن مرة الحضرمي ،وكان قد أدرك بحمص سبعين بدريا من أصحاب رسول الله ﷺ .قال ليث وكان يسمي الجندل الاول المقدم. قال فكتب إليه أن يكتب ما سمع من أصحاب رسول الله ﷺ من أحاديثهم إلا حديث أبي هريرة فإنه عندنا“ (۱)

مجھ سے یزید بن ابوحبیب نے بیان کیا کہ عبدالعزیز بن مروان نے کثیر بن مرہ حضرمی کے پاس خط لکھا، جنہوں نے حمص میں ستر بدری صحابہ سے شرف لقا حاصل کیا تھا اور لیث کے بقول آپ کو جندل اول کہا جاتا تھا، ان کے پاس عبدالعزیز نے لکھا کہ وہ اصحاب رسول سے سنی احادیث کو لکھ کر ان کے پاس ارسال کردیں سوائے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی احادیث کے، کیونکہ وہ ہمارے پاس ہیں۔

سعد بن ابراہیم بھی بہت بڑے عالم اور محدث تھے، مدینہ منورہ کے قاضی تھے، عمر بن عبدالعزیز نے آپ سے بھی احادیث کے دفتر لکھوائے اور تمام بلاد اسلامیہ میں بھجوائے۔

ہشام بن الغار کا بیان ہے کہ عطا بن رباح تابعی (۱۱۴ھ) کو دیکھا کہ وہ حدیثیں بیان کرتے اور ان کے تلامذہ ان کے سامنے لکھتے جاتے۔ (۲)

ابوقلابہ نے وفات کے وقت اپنی کتابیں ایوب سختیانی کو دینے کی وصیت کی تھی، اس وصیت کے مطابق یہ کتابیں شام سے اونٹ پر لاد کر لائی گئیں، ایوب نے بتایا کہ اس کا کرایہ بارہ چودہ درہم دیئے تھے۔

❁❁❁

۱۔ السنۃ قبل تدوینھا، ص: ۳۷۳۔

۲۔ داری، ص: ۶۹، بحوالہ نزھۃ القاری: ۱/۱۸، مطبع سابق۔

حفظ حدیث اور تابعین

ہشام بن عبدالملک نے امام زہری کے حافظہ کا امتحان لینے کے لئے یہ طریقہ اپنایا کہ ایک دن آپ دربار میں کسی ضرورت سے آئے ہوئے تھے، اس نے خواہش ظاہر کی کہ شہزادے کے لئے کچھ حدیثیں لکھ دیں، آپ راضی ہوگئے اور آپ نے چارسو احادیث املا کرادیں، ایک ماہ بعد جب امام زہری دوبارہ پہونچے ہشام نے کہا کہ آپ نے جو احادیث میرے شہزادے کو لکھ کردی تھیں وہ تو ضائع ہوگئیں، آپ نے فرمایا تو پریشانی کی کیا بات ہے لاؤ پھر لکھوائے دیتے ہیں، غرض کہ آپ نے برجستہ پھر چارسو احادیث املا کرادیا، اب سنئے درحقیقت پہلا نسخہ ضائع نہیں ہوا تھا، بلکہ ہشام کی یہ ایک ترکیب تھی، جب امام زہری چلے گئے اور بعد میں لکھائی ہوئی احادیث کا پہلے کی لکھائی گئی احادیث سے مقابلہ کیا گیا تو ایک حرف بھی نہیں چھوٹا تھا۔ (۱)

امام زہری، علقمہ اور عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے منقول ہے کہ وہ ہمیشہ دورۂ حدیث کی تاکید کرتے، اس کا اثر یہ تھا کہ مشہور محدثین کے یہاں دورۂ حدیث کی مجلس رات بھر رہتی، عشا بعد شروع ہوتی تو نماز صبح پر ختم ہوتی۔ (۲)

یونس کہتے ہیں کہ ہم حضرت حسن بصری کے پاس سے حدیثیں سننے کے بعد آپس میں ان کا دور کرتے، یہاں تک کہ اسماعیل بن رجا کا یہ دستور تھا کہ دور کے لئے اگر کوئی نہیں ملتا تو مکتب کے بچوں کو جمع کرکے ان کے آگے حدیثیں پڑھتے تاکہ ضبط احادیث کی کوششوں میں ناغہ نہ ہو۔ (۳)

۱۔ تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۸۷۔

۲۔ دارمی، تہذیب التہذیب: ۱/۲۷۰۔

۳۔ نزہۃ القاری: ۱/۲۴۔

عہد تابعین کا ایک عظیم کارنامہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حدیث کی باقاعدہ ترتیب وتدوین کا خیال مسلمانوں کو عہد تابعین میں ہوا، چنانچہ اسی عہد کے خلیفۂ صادق حضرت عمر بن عبدالعزیز کو امت مسلمہ صبح قیامت تک خراج تحسین پیش کرتی رہے گی، جن کی مساعی جمیلہ سے احادیث کی باقاعدہ تدوین عمل میں آئی۔

۱۰۰ ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے والی مدینہ حضرت ابوبکر بن حزم کے نام یہ حکم بھیجا:

"انظر ما كان من حديث رسول الله ﷺ فاكتبه، فإني خفت دروس العلم وذهاب العلماء، ولا تقبل إلا حديث رسول الله ﷺ وليفشوا العلم، وليجلسوا حتى يعلم من لا يعلم، فإن العلم لا يهلك حتى يكون سراً"(۱)

رسول اللہ ﷺ کی جو بھی حدیث تمہیں نظر آئے، اسے لکھ لو، کیوں کہ مجھے علم کے مٹنے اور علما کے ختم ہو جانے کا ڈر ہے، حدیث رسول ﷺ ہی قبول کرنا، علم پھیلاؤ اور مجلسیں قائم کرو، تاکہ جو نہیں جانتا ہے جان لے، کیوں کہ علم اس وقت تک ضائع نہیں ہوتا ہے جب تک کہ وہ راز نہ بن جائے۔

یہ حکم نامہ بلادِ اسلامیہ کے دوسرے حکام کی طرف بھی روانہ کیا گیا۔

"كذلك كتب إلى عماله في أمهات المدن الإسلامية بجمع الحديث"(۲)

اسی طرح اہم اسلامی شہروں کے عمال کی طرف بھی جمع احادیث کا حکم بھیجا۔

۱۔ سنت خیر الانام، ص: ۱۳۴، ۱۳۵ بحوالہ ضیاء النبی: ۶/ ۱۳۸، مطبع سابق۔

۲۔ سنت خیر الانام، ص: ۱۳۴، ۱۳۵ بحوالہ ضیاء النبی: ۶/ ۱۳۸، مطبع سابق۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی دعوت کے جواب میں سلطنت اسلامیہ کے تمام شہروں میں علما نے احادیث کی جمع وتدوین کا کام شروع کردیا، مدونین کی جماعت کے سرخیل حضرت ابن شہاب زہری تھے، جن کا کچھ ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔امام زہری کے علاوہ جن فرخندہ فال شخصیتوں نے اس عظیم کام میں اپنا تعاون پیش کیا ان میں چند ایک کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

مکہ مکرمہ: عبدالملک بن عبدالعزیز (م ۱۵۰ھ)

مدینہ منورہ: امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ)؛ محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ)؛ اور محمد بن عبدالرحمن (م ۱۵۸ھ)

بصرہ: ربیع بن صبیح (م ۱۶۰ھ)

کوفہ: سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ)

یمن: عبداللہ بن مبارک (م ۱۸۱ھ)

واسط: ہشیم بن بشیر (م ۱۸۳ھ)

رے: جریر بن عبدالحمید (م ۱۸۸ھ)

مصر: عبداللہ بن وہب (م ۱۹۸ھ) (۱)

ان پاکباز شخصیتوں کی شبانہ روز کوششوں سے جا بجا بکھری ہوئی احادیث یکجا ہوئیں، جنہیں مستقل کتابی شکل میں لکھا گیا، اس طرح احادیث میں خرد برد کا جو امکان تھا، ان بزرگوں کے اس کارنامے نے اس کا دروازہ کافی حد تک بند کردیا تھا، اس عہد میں حدیث کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں، جن میں مؤطا امام مالک کی امتیازی شان مسلم ہے۔

۱۔ السنۃ قبل التدوین: ۳۳۷ بحوالہ ضیاء النبی: ۷؍۱۴۰، مطبع سابق۔

کتبِ صحاح کی تدوین

متقدمین کی کتابوں میں صحیح وسقیم میں تمیز کئے بغیر احادیث درج کرنے کا جو رواج تھا اس سے امت مسلمہ کے لئے کئی مسائل پیدا ہو گئے تھے، کون حدیث مرتبہ صحت پر فائز ہے، کون نہیں ہے، متقدمین کی کتابوں میں اس کی صراحت نہیں تھی، اس لئے صحیح وضعیف بلکہ موضوع احادیث کو لے کر امت مسلمہ طرح طرح کی الجھنوں کا شکار ہو رہی تھی، علاوہ ازیں دشمنان اسلام نے موضوع اور ضعیف حدیثوں کا سہارا لے کر اسلام کی جڑیں کھودنی شروع کردیں، ملت اسلامیہ کے علمائے برحق نے بروقت اس خطرے کو بھانپ لیا، اور ایسی کتابوں کی ترتیب وتدوین کی طرف مائل ہوئے جن میں صرف صحیح احادیث کے درج کرنے کا التزام ہو، تاکہ عام مسلمان پورے اعتماد ویقین کے ساتھ ان صحیح احادیث کو اپنے لئے مشعل راہ بنا کر ان پر عمل پیرا ہوں، اور شرپسند عناصر کی دسیسہ کاریوں کا مکمل انسداد ہو جائے۔

وہ بڑی ہی سعید ساعت تھی جب امام بخاری کے استاذ حضرت اسحاق بن راہویہ نے اپنے شاگردوں کے سامنے اس ضرورت کا ذکر کیا اور فرمایا:

"لو جمعتم کتاباً مختصراً لصحیح سنۃ رسول اللہ ﷺ۔ (۱)

کاش تم صحیح سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مختصر کتاب جمع کرتے۔

اپنے استاذ محترم کی یہ بات حضرت امام بخاری کے دل میں گھر کر گئی، اور انہوں نے استاذ مکرم کی خواہش کی تکمیل کے لئے ایک ایسے کام کا بیڑہ اٹھالیا جس نے آپ کو رہتی دنیا تک ساری امت مسلمہ کا محسن بنادیا، امام بخاری نے اپنی کتاب میں صرف انہیں

۱۔ المنھل اللطیف للحدیث الشریف، للعلامۃ المالکی العلوی: ص: ۲۵، دار الفکر، بیروت: ۱۹۷۸ء۔

احادیث کے جمع کرنے کا التزام کیا جو مرتبہ صحت پر فائز تھیں، یعنی جو متصل السند تھیں، ہر قسم کے علت وشذوذ سے پاک تھیں، جن کے رواۃ عادل اور تام الضبط تھے۔

امام بخاری کے بعد پھر کئی دوسرے لوگوں نے یہی کام کیا، جن میں امام مسلم خصوصی طور سے قابل ذکر ہیں۔

اب جب احادیث صحیحہ کتابی شکل میں مدون ہوکر منظر عام پر آگئیں تو اب ان میں خرد برد کا امکان ختم ہوگیا، کیونکہ اگر کوئی وضع حدیث کی کوشش کرتا تو ان صحیح کتابوں کی روشنی میں اس کا چہرہ بے نقاب ہوجاتا۔

اس طرح فتنوں کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا، احادیث نبویہ کے تعلق سے اب کسی ترمیم یا حذف واضافے کا کوئی امکان نہ رہا۔

روایت حدیث میں صحابہ اور دیگر ائمہ حدیث کا احتیاط

روایت حدیث کے سلسلے میں صحابۂ کرام نے احتیاط کا جو نرالا انداز اپنایا تھا، اس کی نظیر ہمیں دور دور تک نہیں ملتی، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وحضرت عمر رضی اللہ عنہ کے احتیاط کا عالم یہ تھا کہ ان بزرگوں کے سامنے لوگ حدیث پڑھنے سے ڈرتے تھے، اگر کوئی پڑھ بھی دیتا تو یہ حضرات اس مقروء حدیث پر گواہ مانگتے، چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ دادی کی وارثت کے سلسلہ سے متعلق جب حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ حدیث پڑھی کہ دادی کا حصہ سدس ۱/۶ ہے، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی عظمت شان اور ان کی جلالت علم کی مطلق پروا نہ کی، اور ان سے اس حدیث پر گواہ پیش کرنے کا مطالبہ، جب حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پر گواہی دے دی تب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مسئلہ دائرہ میں اس حدیث کو مستدل بنایا۔(۱)

یوں ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص تین دفعہ سلام کہے اور صاحب خانہ اندر جانے کی اجازت نہ دے تو وہ خواہ مخواہ اندر جانے پر مصر نہ ہو، بلکہ واپس لوٹ جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک کہ ایک دوسرے صحابی نے اس پر گواہی نہ دے دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شدت وسختی کی وجہ بھی بیان کر دی۔

قال عمر:

۱۔ المنہل اللطیف للحدیث الشریف، للعلامۃ المالکی العلوی: ص: ۳۱، دار الفکر بیروت: ۱۹۷۸ء۔

"إني لم أتهمك ولكني خشيت أن يتقول الناس على ربهم۔" (۱)

اس سے میرا مقصود آپ (ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) کو متہم کرنا نہیں، بلکہ اس خوف کے ناتے ہے کہ کہیں لوگ اپنے رب پر جھوٹ نہ باندھنے لگیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی اسی احتیاط پر عمل کیا گیا، چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

"لا یحل لاحد یروی حدیثا عن رسول اللہ ﷺ لم اسمع بہ فی عھد ابی بکر ولا عھد عمر" (۲)

کوئی شخص ایسی حدیث روایت نہ کرے جسے میں نے شیخین کے عہد میں نہیں سنی ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جو اس خلافت امویہ کے بانی ہیں جس پر مستشرقین نے وضع حدیث کا الزام لگایا ہے، فرماتے ہیں:

" اتقوا الروایات عن رسول اللہ ﷺ إلا ما کان یذکر منھا فی زمن عمر، فان عمر کان یخوف الناس فی اللہ تعالیٰ" (۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث کی روایات سے بچو، ہاں ان احادیث کی روایت کرسکتے ہو جن کا ذکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ملتا ہے، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ کے سلسلہ میں لوگوں کو خوف دلایا کرتے تھے۔

حیرت ہے کہ جس عہد (بنی امیہ) کے لوگ روایت حدیث کے بارے میں اتنے محتاط ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کی روایت کردہ احادیث کے علاوہ کسی حدیث کو قبول کرنے کے روادار نہیں، وضع حدیث کو اس دور کا کارنامہ کہا جاتا ہے۔ (۴)

بعد کے ائمہ حدیث بھی اس احتیاط کا دامن ہمیشہ مضبوطی سے پکڑے رہے، چنانچہ حضرت امام مالک فرماتے ہیں:

۱۔ سنت خیر الانام، ص: ۱۰۸، ۱۰۹، بحوالہ ضیاء النبی: ۷/ ۹۹، ۹۸، مطبع سابق۔

۲۔ السنۃ قبل التدوین، ص: ۹۷۔

۳۔ السنۃ قبل التدوین، ص: ۹۸۔

۴۔ ضیاء النبی: ۷/ ۱۰۵، مطبع سابق۔

"أدركت سبعين ممن يقول: قال رسول الله ﷺ لو أوتمن واحد منهم على بيت مال لكان امينا لم أخذ عنهم لانهم لم يكونوا من أهل هذا الشأن"(۱)

میں ستر ایسے لوگوں کو حدیث بیان کرتے ہوئے پایا کہ ان میں سے کسی کو بھی اگر بیت المال کا امین بنا دیا جاتا تو وہ امانت داری کا مظاہرہ کرتا، پھر بھی میں نے ان سے حدیث صرف اس لئے روایت نہیں کی کہ وہ اس لائق نہ تھے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آئے۔

(۱) حدیث کی حفاظت وصیانت کا کام عہد نبوی سے شروع ہو چکا تھا، جس کے لئے صحابۂ کرام کتابت، حفظ، اور عمل تینوں ذرائع بروئے کار لائے، لہٰذا گولڈ زیہر اور دوسرے مستشرقین کا یہ کہنا کہ حدیث کی حفاظت وصیانت کا کام عہد رسالت کے بعد شروع ہوا صریح جھوٹ ہے۔

(۲) حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور آپ کی تقریرات کا نام ہے، نہ کہ ان اصول وقوانین کا جنہیں پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد پیدا شدہ دینی وسیاسی مسائل سے نبٹنے کے لئے وضع کیا گیا، جیسا کہ مستشرقین کا خیال ہے کہ احادیث ان اصول وضوابط کا نام ہے جنہیں بعد کے مسلمانوں نے اپنے مسائل کو حل کرنے کی غرض سے وضع کئے۔

(۳) حفاظت وتدوین حدیث کا اصل محرک سعادت دارین کی حصولیابی کی سچی تڑپ اور وہ سچا احساس تھا جو اس وقت کے ارباب حل وعقد کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی تھی، کہ مبادا حدیث رسول کی شکل میں موجود علم وحکمت کا یہ گنج گراں مایہ سستی وغفلت کے ناتے حوادث زمانہ کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو کر ضائع نہ ہو جائے، چنانچہ تدوین حدیث کے لئے حضرت عمر بن عبد العزیز نے جو حکم نامہ بلاد اسلامیہ کے عمال کے نام لکھا تھا، اس کے الفاظ ہمارے اس دعویٰ کی بھرپور تائید کرتے ہیں، آپ نے حکم نامے میں لکھا تھا:

"فانظر ما كان من حديث رسول الله ﷺ فإني خفت دروس العلم وذهاب العلماء۔"

۱۔ المنہل اللطیف فی اصول الحدیث الشریف، ص: ۳۲، مطبع سابق۔

حکم نامے کے مذکورہ الفاظ یہ بتلا رہے ہیں کہ حفاظت حدیث کا مقصد صرف اور صرف اس عظیم علمی سرمائے کی حفاظت کر کے آنے والی نسلوں کی طرف اس کو منتقل کرنا تھا، اس کا مقصد نہ تو ان مسائل سے نمٹنا تھا جو سلطنت اسلامیہ کے حدود کی وسعت سے پیدا ہو گئے تھے اور نہ ہی اسلامی حکومت کو استحکام فراہم کرنا تھا۔

(۴) ارشاد رسول ﷺ: "من كذب علیّ متعمداً فليتبوأ مقعده من النار" کے ہوتے ہوئے کس مسلمان کی جرأت ہوتی کہ آپ ﷺ کی طرف کوئی جھوٹی حدیث منسوب کرتا؟ اور اگر کوئی جرأت کرتا بھی تو ائمہ حدیث کو تحقیق و تفتیش کے تیروں سے اس کی جعل سازی کی نقاب کشائی کرنے میں دیر نہ لگتی، ایسے میں یہ کہنا کہ بعد کے مسلمانوں نے رسول اکرم ﷺ کی عظمت شان کے اظہار کے لئے یا اموی خلفا نے اپنی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے، یا متحارب گروپوں نے اپنی تائید اور فریق مخالف کی تردید کے لئے وضع حدیث جیسے جرم کا ارتکاب کیا، یہ الزام صریح جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے؟ اسے تاریخ کے ساتھ کھلا مذاق نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟ کیا یہ صحابہ کرام اور بعد کے ائمہ حدیث کی امانت و دیانت پر انگشت نمائی نہیں ہے؟ وہ صحابہ کرام جن کا حال یہ ہو کہ مارے خوف کے صحیح اور سچی حدیثیں نہ بیان کریں، کیا ان سے یہ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت کے اظہار کے لئے آپ کی طرف جھوٹی حدیثیں گڑھ کر منسوب کریں؟ وہ تابعین عظام کہ حدیث رسول ﷺ کے قبول کرنے کے بارے میں جن کا معیار یہ تھا کہ وہی حدیثیں قبول کرتے جو عہد صدیقی و فاروقی میں موجود و معروف ہیں، کیا ان کے بارے میں کوئی یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ جھوٹی حدیثیں گڑھ کر کے سیاسی و سماجی مسائل کا حل پیش کرتے تھے، یا اپنے موافق حدیثیں گڑھ کر حکومت و خلافت کو مضبوطی عطا کرتے تھے؟ خلافت بنو امیہ پر جو شر پسند مستشرقین وضع حدیث کا الزام عائد کرتے ہیں کیا ان کی نظر خلافت بنو امیہ کے بانی حضرت امیر معاویہ کے اس قول پر نہیں پڑتی ہے؟

"إتقوا الروايات عن رسول الله ﷺ إلا ما كان يذكر منها في زمن عمر، فإن عمر كان يخوف الناس في الله"

اور کیا ان کی نگاہ خلافت بنو امیہ کے مجدد اور حدیث رسول کی باضابطہ تدوین کے

داعی اول حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس ارشاد پر نہیں پڑتی جو انہوں نے اپنے عمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: "ولا یقبل إلا حدیث رسول الله ﷺ" ان دونوں بزرگوں کے حزم واحتیاط کے سامنے گولڈ زیہر کے اس غلط مفروضے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ "اموی حکومت خود بھی حدیث گڑھتی تھی اور لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیتی تھی۔"

رسول کریم ﷺ اپنے عہد میں پیدا شدہ مسائل کو خود ہی اپنے ناخن تدبیر سے حل فرماتے تھے، بعد میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل کا طریقہ آپ نے یہ مقرر فرمایا کہ سب سے پہلے کسی بھی مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرو، اگر قرآن میں نہ پا سکو تو حدیث رسول ﷺ میں اس مسئلہ کو تلاشو، اگر اس میں بھی نہ مل سکے تو جس پر ائمہ مجتہدین اتفاق کرلیں اسی کو اختیار کرو، اور اگر اجماع سے بھی مسئلہ حل نہ ہوسکے تو پھر مذکورہ تینوں اصولوں پر قیاس کر حل کرنے کی کوشش کرو، ان چاروں اصولوں میں سے کسی نہ کسی سے مسئلہ حل ہی ہوجائے گا، اس سلسلہ میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ والی حدیث کا تذکرہ مناسب ہوگا، چنانچہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجنا چاہا تو اس وقت آپ نے ان سے پوچھا۔

"بما تقضي یا معاذ. فقال بكتاب الله. قال فان لم تجد قال بسنة رسول الله قال فان لم تجد قال اجتهد برأی. فقال الحمد لله الذی وفق رسول رسوله بما یرضی به رسوله" (رواه احمد وغیره والحدیث مشهور)(1)

اے معاذ! کس سے فیصلہ کروگے؟ آپ نے عرض کیا کتاب اللہ سے، فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ملے، عرض کیا سنتِ رسول ﷺ سے، فرمایا اگر اس میں نہ ملے، عرض کیا اپنی رائے سے اجتہاد سے کروں گا، آپ نے فرمایا اس اللہ کے لئے تمام تعریفیں ہیں، جس نے اپنے رسول کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی جس سے اس کا رسول خوش ہے۔

مذکورہ بالا حدیث سے تین اصول شرعیہ کا ثبوت ہوا، رہا اجماع تو چونکہ رسول پاک ﷺ کے عہد میں اجماع بطور اصول شرعی رائج نہیں ہوا تھا، اس لئے اس حدیث میں اس کا تذکرہ نہیں، دورِ صحابہ میں اجماع بحیثیت اصول شرعی متعارف ہوا۔

1۔ نور الانوار؛ شیخ احمد معروف بہ ملا جیون؛ ص: ۲۲۸۔

بہر حال عرض یہ ہے کہ جس دین میں مسائل سے نپٹنے کا اتنا نفیس طریقہ موجود ہو، کیا اس دین کے پیروکار دینی مسائل کو حل کرنے کے لئے وضع حدیث کے بھیانک جرم کا ارتکاب کریں گے؟ ہاں اگر کوئی مسئلہ ایسا ہوتا جو ان چار اصولوں سے حل نہ ہو پاتا تب تو یہ بات کہی جاسکتی تھی کہ مجبوراً حل مسئلہ کے لئے حدیث گڑھی گئی ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ قیامت تک جو بھی مسئلہ پیدا ہوگا، انہیں میں سے کسی نہ کسی اصل سے ضرور حل ہو جائے گا، پھر وضع حدیث کی ضرورت کہاں رہی؟

جو مستشرقین ائمہ کرام پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے موقف کی تائید میں حدیث گڑھا کرتے تھے، کیا ان کی نظر حضرت امام مالک کے اس قول پر نہیں پڑتی ہے؟

" أدركت سبعين ممن يقول قال رسول الله ﷺ لو أوتمن واحد منهم على بيت مال لكان أميناً لم آخذ عنهم لأنهم لم يكونوا من أهل هذا الشأن " (۱)

میں نے ستر ایسے لوگوں کو حدیث بیان کرتے ہوئے پایا کہ اگر ان کو بیت المال کا نگراں بنایا جاتا تو وہ امانت داری کا ثبوت دیتے، لیکن میں نے ان سے حدیث نہیں لی، صرف اس لئے کہ وہ اس کے اہل نہیں تھے۔

یوں ہی کیا ان کی توجہ اس واقعہ کی طرف نہیں جاتی ہے کہ ایک شخص نے بڑے فخر سے کہا کہ میں نے سیکڑوں حدیثیں گڑھ کر پھیلا دی ہیں تو دوسرے نے جواب دیا کوئی حرج نہیں یحییٰ بن معین، اور احمد بن حنبل موجود ہیں، وہ چھان پھٹک کر تمہاری گڑھی ہوئی حدیثیں صحیح حدیثوں سے الگ کرلیں گے۔ (۲)

واضح رہے کہ حضرت امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا شمار ائمہ اربعہ میں سے ہوتا ہے، اب مجھے بتایا جائے کہ جن ائمہ کرام کی شان یہ رہی ہو کہ وہ کسی بھی حدیث کو بغیر تحقیق کے قبول نہ کرتے ہوں، اور کسی ایسے شخص سے حدیث نہ لیتے ہوں جو روایت حدیث کے اہل نہیں تو پھر ان پر یہ الزام لگانا کہ انہوں نے اپنے اپنے موقف کی تقویت کے لئے حدیثیں

۱۔ المنهل اللطیف، ص: ۳۲۔

۲۔ نزهة القاری: ۱/ ۲۹۔

گڑھی ہوں گی کتنا بڑا ظلم اور ناانصافی ہے؟

(۵) احادیث رسول ﷺ میں عیسوی یا موسوی تعلیمات کا موجود ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ احادیث مسلمانوں نے توریت، انجیل یا اور کسی آسمانی صحیفے سے اخذ کر کے ان کو حدیث کا رنگ دے دیا ہوگا، ورنہ تو ہر کوئی جانتا ہے کہ مسیحیت اور نصرانیت میں بہت ساری باتیں مشترک ہیں، تو اگر دین مسیحیت کی کوئی بات دین یہودیت سے میل کھا جائے، یا توریت کی کوئی تعلیم انجیل میں مل جائے تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دین مسیحیت اور انجیل کی وہ تعلیمات جو دین یہودیت اور توریت میں موجود ہیں، وہ یہودیت یا توریت سے ماخوذ ہیں؟ اور بعد کے عیسائیوں نے توریت سے اخذ کر کے ان تعلیمات کو گڑھا ہے۔

(۶) حدیث کی جرح وتعدیل اور ان کو پرکھنے کے لئے مسلمانوں نے ایسے ایسے اصول وقوانین مرتب کئے ہیں کہ جن کی موجودگی میں حدیث صحیح کو موضوع یا جعلی حدیثوں سے الگ کرنے میں کوئی دقت نہیں پیش آتی ہے، نیز ائمہ حدیث نے موضوع اور غلط حدیثوں سے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں صحیح اور غلط حدیثوں کو الگ الگ بیان کیا ہے، ایسے میں مستشرقین کا یہ دعویٰ کرنا کہ حدیث کا اکثر مواد جعلی ہے، سفید جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے؟ جو جعلی یا موضوع ہے، وہ حدیث ہی کہاں ہے؟ حدیث تو وہ ہے جو نبی کریم ﷺ یا آپ کے صحابہ وتابعین سے ثابت ہو۔

7

باب چہارم

سیرتِ نبوی اور مستشرقین

- سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق مستشرقین کے عام نظریات
- خاندانِ رسالت اور مستشرقین
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق عالیہ اور مستشرقین

مستشرقین اور سیرتِ نبوی

بحیثیت مسلمان ایک انسان پر رب قدیر کی وحدانیت کے اقرار کے بعد سب سے اہم فریضہ یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی محبت وعقیدت کو اپنی رگ رگ میں بسائے۔

محمد کی محبت دین حق کی شرطِ اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

ایک مسلمان کی سب سے بڑی روحانی طاقت عشق رسول ﷺ ہے، جس کے دل میں جتنی زیادہ محبت رسول ﷺ کی کارفرمائی ہوگی اتنی ہی زیادہ اس کے ایمان میں پختگی، ایقان میں مضبوطی اور اطاعت الٰہی میں تیزی ہوگی، گویا عشق رسول ﷺ ہی جان ایمان ہے، اسی پر ایمان کی بلند وبالا عمارت ایستادہ ہے، یہی وہ جوہر ایمان ہے جس سے ایمان میں جلا اور روشنی پیدا ہوتی ہے، یہی وہ شمع تاباں ہے جس کی تپش عاشقان برحق کو راہ حق میں سب کچھ لٹانے پر مجبور کردیتی ہے، یہی وہ سرمدی نعمت ہے جس کی حصولیابی کا جذبہ کتنوں کو شہید، کتنوں کو صدیق اور کتنوں کو ولی اور قطب بنادیتا ہے۔

یہ حقیقت ذی ہوش افراد سے اوجھل نہیں ہوگی کہ کسی بھی شخصیت کے تعلق سے انسان کے دل میں عقیدت ومحبت کا جذبہ اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب کہ وہ شخصیت ہر قسم کی برائیوں اور بے حیائیوں سے پاک ہو، اس کی حیثیت شفاف آئینہ کی طرح ہو، اس کی عظمت وعزت کا افق کافی بلند ہو، اور وہ ہر اس رذیل اور ذلیل حرکت سے دور رہتا ہو جو کسی انسان کو عیب دار بنادیتی ہے، اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کسی بھی شخصیت کی عقیدت ومحبت کسی کے دل میں ڈالنی ہو تو ضرورت اس بات کی پڑے گی کہ اس کی

خوبیوں، اچھائیوں اور اس کی سیرت و کردار کی رفعتوں سے روشناس کرایا جائے، اور کسی کی محبت چھیننی ہو تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے تعلق سے ایسی باتیں پھیلادی جائیں جو کسی بھی عظیم شخصیت کے لئے معیوب سمجھی جاتی ہیں۔

مستشرقین اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ ایک مسلمان کے ایمان کو کمزور کرنے کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ اس کے دل میں موجود محبت رسول ﷺ کے اس چراغ کو بجھادیا جائے جو اس کو ظلمتوں سے لڑنے کا حوصلہ، باطل قوتوں سے ٹکرانے کا جذبہ اور کفر و الحاد کی آندھیوں کے خلاف صف آرائی کی امنگ عطا کرتا ہے، اس کے لئے انہوں نے رحمت عالم ﷺ کی عظمت و رفعت کو نشانہ بنانا شروع کردیا، آپ کے کردار و سیرت پر کیچڑ اچھالنے کا آغاز کیا، آپ کے تعلق سے نہ جانے کیا کیا خرافات گڑھے، آپ کے خاندان کو متبذل، آپ کو مفلس و لاچار، بت پرست اور مصروع تک ثابت کرنے کی کوشش کی، چنانچہ علامہ پیر کرم شاہ ازہری فرماتے ہیں:

''مستشرقین نے حضور کے دامن کو داغدار کرنے کے لئے مختلف انداز اختیار کئے، انہوں نے آپ کو اپنے ڈراموں، فلموں اور تصویری کہانیوں کے ناپسندیدہ کردار کی شکل میں پیش کیا، کبھی آپ کے جسد انور کو جہنم کے پست ترین درجوں میں دکھایا، کبھی یہ ظاہر کیا کہ حضور ﷺ کا جسد انور زمین و آسمان کے درمیان معلق ہے، کبھی آپ کو دشمن مسیح علیہ السلام بناکر پیش کیا، کبھی آپ کو ایک بت کی شکل میں پیش کیا، کبھی انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ حضور ﷺ نے ایک کبوتر پال رکھا تھا، جو آپ کے کانوں پر آکر بیٹھتا اور آپ لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے کہ یہ فرشتہ ہے جو وحی لے کر آیا ہے۔'' (۱)

ذیل میں ہم چند اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے تعلق سے مستشرقین کا نظریہ کیا تھا اور کس طرح سے انہوں نے آپ کی سیرت و کردار کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) ڈانٹے (Dante) حضور ﷺ کو جہنم کے اٹھائیسویں درجے میں دکھاتا ہے، ان کا جسم سر سے کمر تک دولخت ہے، وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ چاک کرتے نظر آتے

۱۔ ضیاء النبی: ۷/۱۶۲؛ مطبع سابق۔

ہیں، وجہ یہ ہے کہ وہ ان روحوں کے سرخیل ہیں، جنہوں نے مذہب میں فرقہ بندی کرایا تھا۔(۱)

(۲) کچھ مواقع ایسے آتے ہیں جب بے قراری وجد یا کشف کی شکل اختیار کر لیتی ہے ہم ان کی تفصیلات سے بہت کم آگاہ ہیں، بعض عیسائی مصنفین نے ان کیفیات کو مرگی کے دورے قرار دیا ہے، اور ان کا تعلق ان علامات سے جوڑا ہے جو آپ کے بچپن میں نظر آتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ آپ کی زندگی کے آخری حصے میں بھی نزولِ وحی سے پہلے آپ پر اس قسم کی غشی اور بیداری کے سپنے کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔(۲)

(۳) وہ کھلے عام اپنی رائے کا دفاع کرنے کی ہمت سے عاری ہیں، جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ دھوکہ دینے اور حیلے بہانے سے مفاد حاصل کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔(۳)

(۴) انسان یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ نیچے لکھی ہوئی آیت جیسی آیات قرآن میں محمد کی حاسدانہ فطرت کس طرح عیاں ہوتی ہے۔(۴)

(۵) اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی شخصیت نت نئے لوگوں کے دل جیتنے کے شوق میں پرانی دوستیوں اور وفاداریوں کو نظر انداز کرنے کا رجحان رکھتی ہے۔(۵)

(۶) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر اب ساٹھ سال کے قریب تھی، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ عمر میں (اضافے کے ساتھ ساتھ جنس کے معاملہ میں ان کی کمزوری میں اضافہ ہو رہا تھا اور ان کے بڑھتے ہوئے حرم کی کشش ان کو اپنی حدود سے تجاوز سے باز رکھنے کے لئے کافی نہ تھیں۔(۶)

(۷) پیغمبر نے اپنی اور اپنے تمام صحابہ کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے

۱۔ محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ: ص: ۷۲، مطبع جارج ایلن اینڈ انون لمیٹیڈ، لندن: ۱۹۵۶ء۔

۲۔ محمد اینڈ اسلام: ص: ۲۲: ریلیجن ٹریکٹ سوسائٹی، لندن۔

۳۔ محمد اینڈ اسلام: ص: ۱۴۳: ریلیجن ٹریکٹ سوسائٹی، لندن۔

۴۔ محمد اینڈ اسلام: ص: ۱۳۸: ریلیجن ٹریکٹ سوسائٹی، لندن۔

۵۔ محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ: ص: ۱۸۷۔

۶۔ محمد اینڈ اسلام، سر ولیم میور: ص: ۱۲۶، مطبوعہ، لندن۔

جو طریقہ اپنایا وہ ان تجارتی کاروانوں کو لوٹنے کا تھا جو شام جاتے ہوئے یا شام سے واپس آتے ہوئے مدینہ کے پاس سے گزرتے تھے۔(۱)

مذکورہ بالا اقتباسات رسول اللہ ﷺ کے متعلق مستشرقین کے دلوں میں موجود گھناؤنے خیالات اور نظریات کی عکاسی کے لئے کافی ہیں، ان اقتباسات کی روشنی میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ کے تعلق سے مستشرقین نے کیا کیا زہرافشانی کی ہے اور کس طرح سے انہوں نے اس عظیم ذات کی محبت کو مؤمنین کے دلوں سے نکالنے کی سعی لاحاصل کی ہے، لیکن شاید مستشرقین کو نہیں معلوم ہے کہ جن کاغذی دلائل اور تاریخی حوالوں سے انہوں نے جھوٹ اور تہمت زنی کے یہ افسانے تراشے ہیں، ان سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم دلائل آپ ﷺ کی عظمت و رفعت کو ثابت کرنے کے لئے موجود ہیں، بھلا بتایئے کہ وہ شفاف سیرت و کردار جس پر ابوجہل اور ابولہب جیسے دشمنان اسلام کو انگشت نمائی کا موقع نہ مل سکا، اس پر آج کے مستشرقین کیچڑ اچھال کر کیا کر سکتے ہیں؟ کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ اسی مقدس ذات کی سیرت کی ضوبار کرنوں نے صدیق اکبر اور فاروق اعظم جیسے دانشوروں کے نہاں خانوں میں لافانی انوار و تجلیات بھر دیئے تھے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ اسی مقدس ہستی کے آئینۂ حیات کو دیکھ کر نا جانے کتنوں نے اپنی بھٹکی زندگی کو جادۂ مستقیم پر گامزن کر لیا تھا، کیا یہ امر واقعی نہیں کہ ہرقل کے دربار میں ابوسفیان جیسے مخالف رسول ﷺ کو ایک بھی ایسا لفظ یا ایک بھی ایسا عیب نہ مل سکا تھا کہ جس کو آپ ﷺ کے اوپر چسپاں کرتا؟ اگر ہاں اور یقیناً ہاں! تو پھر چند صدیوں پیشتر کی پیداوار مستشرقین کی اس ذریت کو کیا ہو گیا ہے جو اس عظیم ذات کو طرح طرح کے الزامات کا نشانہ بنا رہی ہے؟ اور آپ ﷺ کی سیرت و شخصیت کو مجروح کر رہی ہے؟

مستشرقین نے حضور کی سیرت پر جو اعتراضات کئے ہیں، ان کی مختلف نوعیتیں ہیں، عربوں کے یہاں خاندانی وجاہت ایک بہت بڑا انسانی کمال شمار ہوتا تھا، مستشرقین حضور کی خاندانی وجاہت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جدید مادیت زدہ دور میں دولت کو انسانی عظمت کی کسوٹی سمجھا جاتا ہے، مستشرقین اس کسوٹی کو حضور ﷺ پر لاگو کر کے آپ کا

۱۔ محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ، ص: ۱۴۰، مطبع سابق۔

مقام گرانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بیسویں صدی عیسوی کی مادی اقدار کو ساتویں صدی عیسوی کے عربوں پر منطبق کر کے مکہ کی مارکیٹ میں ایسے طاقت ور اجارہ داروں کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں، جو کمزور قبائل کو تجارت کے میدان میں سر اٹھانے کی مہلت نہ دیتے تھے، حضور ﷺ کو دھوکہ باز ثابت کرنے کے لیے وہ پورا زور لگاتے ہیں، تاکہ یہ ثابت کریں کہ حضور ﷺ نے یہودیت اور عیسائیت سے تعلیمات اخذ کیں، ان کی بنیاد پر ایک دین وضع کیا، اور دعویٰ کیا کہ یہ دین الہامی ہے، اور اللہ تعالٰی کی طرف سے نازل ہوا ہے، وہ حضور ﷺ کے اخلاق پر حملہ کرتے ہیں، آپ کو شہوت پرست اور ظالم قرار دیتے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ کسی اصول کے پابند نہ تھے، بلکہ جب ضرورت پڑتی تھی اصولوں کو توڑ دیتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ انہیں وحی کے ذریعہ اس غلط اصول کو توڑنے کا حکم ملا ہے۔(۱)

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ دریدہ دہن مستشرقین کس کس انداز میں دامن رسالت پر کیچڑ اچھالتے ہیں، مذکورہ بالا اقتباس سے سیرت نبوی پر مستشرقین کے بیجا اعتراضات کی تین نوعیتیں سمجھ میں آتی ہیں۔

(۱) رسول اللہ ﷺ کے خاندانی وقار اور نسبی عظمت پر حملہ کرتے ہیں۔

(۲) آپ ﷺ کی سماجی حیثیت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۳) رسول پاک ﷺ کے اخلاق کریمانہ پر اعتراضات کا نشتر برساتے ہیں۔

ہم ذیل میں ان میں سے ہر ایک نوعیت پر الگ الگ بحثیں پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہو جائے گا کہ رسول اعظم ﷺ کی حیات طیبہ کا ہر پہلو مستشرقین کی پہونچ سے بہت اونچا ہے، اور آپ کا خاندان، آپ کی سماجی حیثیت اور آپ کے اخلاق کریمہ سب ممتاز اور نرالے ہیں اور ان پر انگشت نمائی وہی کرے گا جس کو رب العزت نے بصیرت وآگہی سے محروم رکھا ہو۔

۱۔ضیاء النبی: ۷/ ۱۶۸؛ مطبع سابق۔

خاندانِ رسالت اور مستشرقین

رسول پاک ﷺ کی ولادت ایک ایسے خاندان میں ہوئی، جس کو عرب میں ایک امتیازی شان حاصل تھی، عرب کے تمام قبائل میں اس خاندان کو عزت وعظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، رحمت عالم ﷺ کی اصل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جا کر ملتی ہے، حضرت ابراہیم کے بیٹوں میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جو عظمت حاصل تھی وہ اور کسی کو حاصل نہیں تھی، رسول پاک ﷺ حضرت اسماعیل ہی کی اولاد سے ہیں، رحمت عالم ﷺ نے اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

"قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ اصطفیٰ من ولد ابراھیم اسماعیل واصطفیٰ کنانۃ من بنی اسماعیل، واصطفیٰ من بنی کنانۃ قریشا واصطفیٰ من قریش بنی ھاشم واصطفانی من بنی ھاشم"(۱)

یعنی رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم میں سے حضرت اسماعیل کو چنا، اور بنو اسماعیل میں سے کنانہ کو چنا اور کنانہ سے قریش کو منتخب فرمایا، اور قریش میں سے بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو چنا۔

مندرجہ بالا حدیث پاک سے ثابت ہوگیا کہ رحمت عالم ﷺ جس خاندان میں پیدا ہوئے، وہ کوئی معمولی خاندان نہیں تھا، بلکہ تمام قبائل اور خاندانوں میں سے منتخب خاندان تھا، جس کے اندر ابراہیمی عظمت وجلال کی خمیر شامل تھی، اور جس کے افراد کی رگوں میں ذبیح اللہ کے ایثار وفداکاری کا جذبہ موجود تھا، یہی وجہ ہے کہ ابوسفیان جو کہ ایمان لانے سے قبل رسول اللہ ﷺ کے سب سے بڑے دشمن تھے جب ہرقل نے ان سے آپ ﷺ کے خاندان اور حسب ونسب کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے برجستہ کہا: "وفینا ذونسب"، اور آپ ﷺ ہم میں اونچے نسب والے ہیں۔

۱۔ سنن ترمذی: ۵/۵۴۵، ۵۴۴، دار الکتب العلمیۃ، بیروت: ۱۹۸۸ء۔

حضور اکرم ﷺ کی نسبی اور خاندانی عظمت کے اظہار کے لیے اپنے وقت کے سب سے بڑے مخالف رسول کے یہ چند الفاظ ہی کافی ہیں، تاہم یورپ وامریکہ کے مستشرقین شاید بصارت وبصیرت دونوں سے محروم ہیں کہ ان کو اجالے دن کی طرح چمکنے والے یہ دلائل نظر نہیں آتے ہیں، آیئے ہم پہلے اس سلسلے میں مستشرقین کی تحریروں کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، ولیم میور اپنی کتاب محمد اینڈ اسلام ص ۵ میں لکھتا ہے:

''اس صدمے نے آپ پر اور بھی اثر ڈالا، کیوں کہ عبدالمطلب کے بیٹے اپنے باپ کے وقار کو بحال نہ رکھ سکے تھے اور انھوں نے بعض ان عہدوں سے دست برداری اختیار کرلی تھی، جن پر ان کے والد فائز تھے، اس لیے وہ پست معیار زندگی پر قانع ہوگئے تھے۔''

منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

''محمد (ﷺ) کے سرپرست صرف یہ احتیاط کرتے کہ وہ بھوک سے مر نہ جائیں اس سے زیادہ وہ ان کے لیے کچھ نہ کرسکتے تھے، خصوصاً جب کہ اس زمانے میں بنو ہاشم کی مالی حالت گرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ایک یتیم جس کے مفادات کی دیکھ بھال کے لیے جسمانی طور پر اہل کوئی آدمی موجود نہ تھا، اس نے اپنے کاروباری زندگی کا آغاز انتہائی کمزور طریقے سے کیا اور یقیناً اس کے علاوہ ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔''(۱)

علامہ پیر کرم شاہ ازہری مذکورہ بالا اقتباسات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مستشرقین کی کتابوں میں اس قسم کی تحریریں جابجا ملتی ہیں اس قسم کی تاریخ نویسی سے مستشرقین کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تحریک اسلامی کو طبقاتی کشمکش سے جنم لینے والی ایک تحریک قرار دے سکیں، اور یہ ثابت کرسکیں کہ مکہ والوں نے حضور ﷺ کی جو مخالفت کی تھی اس کہ وجہ مذہبی اور نظریاتی اختلاف نہ تھا بلکہ مکہ کے امیر وغریب طبقے ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار تھے، بااثر تاجروں کا طاقت ور طبقہ کسی کمزور کو تجارت کے میدان میں آگے بڑھتے نہ دیکھنا چاہتا تھا اور غریب طبقہ سرمایہ داروں کی پالیسیوں سے تنگ تھا، اور ان کے خلاف کارروائیوں کے لیے موقع کی تلاش میں تھا، مستشرقین ان خیالی افسانوں کے ذریعے اسلام پر دو طریقوں سے حملہ کرنا چاہتے ہیں ایک طرف تو وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ

۱۔ محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس مین، ص: ۸، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن: ۱۹۶۱ء۔

اسلام جو اس سرعت سے پھیلا کہ چند سالوں میں پورے جزیرۂ عرب کو اپنے کنٹرول میں لے لیا اس کی وجہ اسلام کی تعلیمات کی کشش اور پیغمبر اسلام اور آپ کے صحابہ کے کردار کی پختگی نہ تھی بلکہ یہ تو ایک ایسا انقلاب تھا جس کے لیے حالات انتہائی سازگار تھا، معاشرہ طبقوں میں بٹ چکا تھا، امیر امیر تر ہو رہے تھے اور غریبوں کی حالت دن بدن ناگفتہ بہ ہو رہی تھی، طاقت ور طاقت کے نشے میں مست تھے، اور کمزور ظلم کی چکی میں پس رہے تھے، ان حالات میں کمزور طبقے میں ایک باصلاحیت آدمی اٹھا، طاقت ور لوگوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے سب لوگ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور اس نے ان مغلوب طبقوں کی مدد سے پورے جزیرۂ عرب میں انقلاب برپا کر دیا۔"(۱)

آیئے ہم خاندان نبوت کے حوالے سے چند حقائق پیش کرتے ہیں جو اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کا خاندان ہمیشہ ایک ممتاز خاندان رہا ہے اور آپ کا قبیلہ تمام قبائل عرب کا حاجت روا، ان کی امیدوں کا مرکز اور ان کے وفود کا مرجع رہا ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ کی ولادت سے کچھ ہی دن پیشتر ابرہہ نے مکہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی، حملہ کرنے سے قبل اس نے حناطہ حمیری نامی ایک شخص کو اہل مکہ کے پاس بھیجا اور اس کو حکم دیا کہ جا کر اہل مکہ میں سے جو سب سے معزز انسان ہوگا، اس کے بارے میں لوگوں سے پوچھ لینا اور پھر اس سے کہنا کہ بادشاہ ابرہہ تم لوگوں سے لڑنے کے لیے نہیں آیا ہے، مزید ابرہہ نے کہا کہ اگر وہ جنگ کا ارادہ نہ کریں تو ان کو میرے پاس لے آؤ، آگے کا واقعہ سیرت ابن ہشام میں یوں درج ہے:

"فلما دخل حناطة مكة سأل عن سيد قريش وشريفها فقيل له عبد المطلب"(۲)

پورے واقعہ کی تفصیل سیرت ابن ہشام میں آپ دیکھ سکتے ہیں، مذکورہ بالا واقعہ کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عبد المطلب جو کہ خاندان بنو ہاشم ہی سے تھے، اور جو رحمت عالم ﷺ کے دادا تھے، ان کے عہد میں ان کی کتنی عزت تھی، اس کا اندازہ آپ اسی

۱۔ ضیاء النبی: ۷/ ۲۰۲، مطبع سابق۔

۲۔ سیرۃ ابن ہشام: ج اول: ص: ۴۸، شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابی الحلبی واولادہ، مصر: ۱۹۵۵ء۔

سے لگا سکتے ہیں کہ اہل مکہ نے ابرہہ کے پاس آپ کو اپنا سردار اور نمائندہ کے طور پر بھیجا تھا، اور آپ ان میں سب سے معزز سمجھے جاتے تھے، مذکورہ بالا واقعہ میں اس امر کی بھی صراحت ہے کہ حضرت عبدالمطلب کے دو سو اونٹ ابرہہ کے لشکری ہانک لے گئے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالمطلب اگر ایک طرف خاندانی لحاظ سے بہت اونچے تھے، تو دوسری طرف مال داری میں بھی آپ کسی سے کم نہ تھے، نبی کریم ﷺ کے والد گرامی کا انتقال آپ کی ولادت سے قبل ہی ہو چکا تھا، اس لیے بعد ولادت تربیت آپ کی ماں ہی کی گود میں ہوئی، چھ سال کی عمر میں جب ماں بھی رحلت فرما گئیں تو پھر آپ کی پرورش کا ذمہ آپ کے دادا عبدالمطلب ہی نے اٹھایا تھا تقریباً دو سال آپ ان کی کفالت میں رہے۔

☆ جب کفار مکہ شمع رسالت کو بجھانے کی ہزار کوششوں کے باوجود اس کی لو کو مدھم نہ کر پائے تو عاجز ہو کر ابوجہل کی ایما پر انھوں نے قصی بن کلاب کے گھر میں ایک مشاورتی میٹنگ کا انعقاد کیا جس کا بنیادی موضوع بحث یہی تھا کہ نبی کریم ﷺ سے کس طرح سے نبٹا جائے، جب سب لوگ جمع ہو گئے تو ہر ایک نے اپنی اپنی رائے دی، مگر سب کی رائے نا قابل قبول ٹھہری، ابوجہل نے جو رائے دی وہی قبول کی گئی تھی، اس نے یہ رائے دی کہ ہم نبی کریم کے قتل کے لیے ہر قبیلہ سے مضبوط دل و دماغ کا ایک ایک نوجوان منتخب کریں، اور رات کے وقت سب یکبارگی آپ پر حملہ کر دیں اور اس طرح آپ کو شہید کر دیں، اس نے اپنی اس رائے کی تائید میں جو دلیل دی تھی وہ یہ ہے:

"فانهم اذا فعلوا ذالك تفرق دمه في القبائل جميعا فلم يقدر بنو عبد مناف على حرب قومهم جميعا فرضوا منا بالعقل فعقلناه لهم"(۱)

کیوں کہ جب لوگ ایسا کریں گے تو محمد ﷺ کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا، لہذا بنو عبد مناف تمام قوموں سے جنگ نہیں کر پائیں، تو ہم سے خون بہا پر راضی ہو جائیں گے تو ہم ان کو خون بہا دے دیں گے۔

مذکورہ بالا عبارت ابوجہل کے دل میں چھپے اس خوف کی بھرپور عکاسی کر رہی ہے جو

۱۔ سیرۃ ابن ہشام: ج اول، ص: ۴۸۲، شرکۃ مکتبۃ و مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی و اولادہ، مصر: ۱۹۵۵ء۔

اس کو نبی کریم ﷺ کے خاندان کی طاقت وقوت اور معاشرے میں ان کی عظمت ووقار کی بنا پر لاحق تھا، ورنہ اگر آپ کا قبیلہ اور خاندان ایک معمولی اور عام خاندان ہوتا تو پھر آپ کے قتل کے لیے اتنے سارے قبائل کے نوجوانوں کو نہ شامل کیا جاتا، اور نہ اس طرح کی خفیہ پلاننگ کی ضرورت پیش آتی، یہ واقعہ بھی نبی کریم ﷺ کی خاندانی وجاہت کا خطبہ پڑھ رہا ہے۔

☆ابھی ہم نے ذکر کیا ہے کہ قیصر روم ہرقل کے پاس جب نبی کریم ﷺ کا مکتوب گرامی پہونچا تو اس وقت اس نے ابوسفیان کو آپ ﷺ کے تعلق سے جانکاری حاصل کرنے کے لیے طلب کیا ابوسفیان سے جب ہرقل نے پوچھا کہ ان کا نسب تمہارے درمیان کیسا ہے، تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ 'وفینا ذونسب'(۱) اور ہم میں آپ اعلیٰ نسب والے ہیں۔

واضح رہے کہ ابوسفیان جن ایام میں یہ واقعہ پیش آیا، نبی کریم کے سخت مخالف تھے اور آپ خود ہی کہتے ہیں کہ اگر مجھ کو ڈر نہ ہوتا کہ لوگ میرے جھوٹ کی نقل کریں گے تو میں جھوٹ بول ہی دیتا، پھر بھی اتنے بڑے مخالف سے آپ کے خاندان کے تعلق سے جب پوچھا گیا تو اگر واقعۃً آپ کے خاندان کی وہی حالت ہوتی، جسے مستشرقین نے اپنی خوشنما تحریروں میں دکھانے کی کوشش کی ہے تو کیا ابوسفیان اس کو قیصر کے سامنے بیان کرنے سے چوکتے؟

☆جس وقت اہل مکہ نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، نبی کریم ﷺ کے حکم سے انھوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، مگر جب کفار مکہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن عاص کو نجاشی شاہ حبشہ کے پاس بھیجا، تاکہ تحفے تحائف دے کر نجاشی کو اس بات پر راضی کرلیں کہ وہ ان مسلمانوں کو واپس ہمارے پاس بھیج دے جب یہ دونوں فرستادے نجاشی کے پاس پہونچے، تو نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر ان سے حقیقت حال پوچھا، اس پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا:

"ایها الملك کنا قوما اهل جاهلیة نعبد الاصنام و ناکل المیتة

۱۔ ضیاء النبی: ۱۸۹/۴۔

وناتی الفواحش ونقطع الارحام ونسیء الجوار ویاکل القوی منا الضعیف فکنا علی ذالك حتی بعث الله الینا رسولا منا نعرف نسبه وصدقه وامانته وعفافه"(۱)

اے بادشاہ! ہم جاہل لوگ تھے، بتوں کی پرستش کرتے اور مردار کھاتے تھے، برائیوں کا ارتکاب کرتے، قطع رحمی کرتے، پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کرتے اور ہم میں سے طاقت ور کمزور کو کھا جاتا تھا، ہم اسی حالت پر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے پاس ایسا رسول بھیجا جس کے نسب سچائی، امانت داری اور پاک دامنی سے ہم آشنا تھے۔

مذکورہ بالا تاریخی واقعہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ نبی کریم ﷺ کا نسب اور خاندان اہل عرب میں معروف اور محترم تھا، ورنہ اگر آپ کا تعلق کسی پسماندہ اور معمولی خاندان اور نسب سے ہوتا تو نجاشی کے سامنے مقام مدح میں اس کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

ابوجہل کو اہل مکہ میں جو عظیم حیثیت حاصل تھی، اس کا اعتراف خود مستشرقین کو ہے، اس بلند رتبہ کے باوجود ایک بار جب ابوجہل نے سرکار کی توہین کی تو آپ کے چچا حضرت حمزہ نے سب کے سامنے اس کی مرمت کی، اور مکہ کے کسی بھی امیر یا با اثر فرد کو حمزہ کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہوئی، اگر حمزہ کا تعلق کسی غریب اور پسماندہ خاندان سے ہوتا تو کیا حمزہ ایک ایسے شخص کو جس کو اہل مکہ اپنا سردار مانتے تھے اور اس کی علمی رفعتوں کو ابوالحکم کہہ کر سلام کرتے تھے، ایسے شخص کو مارنے کی جرأت کر پاتے؟

☆ چشم فلک آج بھی اس واقعہ سے پرنم ہوگی، جب اہل مکہ کے با اثر افراد کے ایک وفد نے ابوطالب سے مل کر ان کے سامنے یہ دھمکی دی تھی کہ آپ یا تو اپنے بھتیجے کو ہمارے معبودوں کی توہین سے باز رکھیں یا پھر آپ راستے سے ہٹ جائیں ہم ان سے نپٹ لیں گے، نبی کریم ﷺ کو بلا کر ان کے سامنے یہ صورت حال رکھی گئی تو آپ نے اشک آلودہ آنکھوں سے اپنے چچا سے کہا تھا کہ باخدا میرے داہنے ہاتھ میں اگر سورج رکھ دیں اور بائیں میں چاند تو بھی میں اس خدائی مشن سے نہیں ہٹوں گا، بھتیجے کے اس جواب کو سن کر

۱۔ سیرۃ ابن ہشام: ج:۱ر۳۳۶، مطبع سابق۔

ابو طالب نے اہل مکہ کو دوٹوک میں جواب دے دیا کہ دیکھئے میں ہر قیمت پر اپنے بھتیجے کا دفاع کروں گا، تاریخ شاہد ہے کہ جب تک ابو طالب زندہ رہے کسی کو بھی سرکار رسالتمآب ﷺ پر دست درازی کی جرأت نہ ہوسکی، اگر آپ کا خاندان بقول مستشرقین کمزور ہوتا تو کیا اہل مکہ ابو طالب کے اس سخت جواب پر خاموش بیٹھتے یا ان سے مقابلہ آرائی کے لیے تیار ہو جاتے؟

اخیر میں ہم مغرب کے مستند اور مشہور مورخ 'گبن' کی ایک تحریر پیش کرتے ہیں، جو مستشرقین کے تمام مزعومات کی قلعی کھول رہی ہے۔

"آپ کا اسماعیلی النسب ہونا قومی اعزاز تھا، یا افسانہ لیکن اگر ان کے نسب نامے کی ابتدائی کڑیاں تاریک اور مشکوک ہوں تو بھی وہ اپنے نسب نامے کی کئی نسلوں میں ایسے عظم لوگ پیش کرسکتے ہیں جو حقیقی معنوں میں شریف اور عظیم تھے، انھوں نے قریش کے قبیلے اور ہاشم کے خاندان میں جنم لیا تھا، جو معزز ترین عرب تھے، مکہ کے بادشاہ تھے اور خانہ کعبہ کے موروثی پاسباں تھے، محمد کے دادا عبد المطلب تھے جو ہاشم کے بیٹے تھے، وہ ہاشم جو مالدار اور سخی شہری تھے۔(۱)

مذکورہ بالا اقتباس ان مستشرقین کے منہ پر ایک زناٹے دار طمانچہ ہے جو کسی بھی خاندان یا قبیلے کی عظمت یا پسماندگی کا معیار دولت کو قرار دیتے ہیں، حالانکہ متعدد تاریخی دلائل خود مذکورہ تحریر سے ثابت ہے کہ ساتویں صدی میں اہل مکہ اور پورے عرب میں کسی بھی خاندان کے لیے اس کی دولت وثروت سرمایہ افتخار نہیں مانی جاتی تھی، بلکہ ان کی عظمت کا تاج محل ان کی جرأت وہمت، ان کی راست بازی اور ان کی سخاوت ومہمان نوازی کے ستونوں پر ایستادہ تھا، اور بنو ہاشم ان تمام معاملات میں یکتائے روزگار تھے، حضرت حمزہؓ کی جرأت کو آپ دیکھ چکے ہیں، عبد المطلب کی راست بازی اور ان کی سخاوت ضرب المثل تھی، اگر یقین نہ آئے تو آئیے سب سے بڑے دشمن رسول ابو جہل کے اس نظریے کو دیکھ لیا جائے، ابو جہل نے ایک موقع پر اخنس بن شریق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"تنازعنا نحن وبنو عبد مناف الشرف اطعموا فاطعمنا، وحملوا

۱۔ دی ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر ص ۲۲۹ بحوالہ ضیاء النبی ۷ ر ۲۰۲، مطبع سابق

فحملنا، واعطوا فاعطينا، حتى اذا تجاذينا على الركب و كنا كفرسي رهان قالوا منا نبي ياتيه الوحي من السماء فمتى ندرك مثل هذا والله لانؤمن به ابدا ولا نصدقه"(۱)

ہم اور بنو عبد مناف نے سرداری کو لے کر جھگڑا کیا، چنانچہ انھوں نے غریبوں کو کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا، انھوں نے لوگوں کے بوجھ اٹھائے اور ہم نے بھی اٹھایا، اور جب مقابلے کے دو گھوڑوں کی طرح برابر ہو گئے، تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہم میں سے ایک شخص کو نبوت ملی ہے جس کے پاس وحی آتی ہے، ہم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں؟ باخدا ہم نہ تو اس پر ایمان لائیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے۔

ابوجہل کی مذکورہ بالا تقریر اس بات کی بین دلیل ہے کہ بنو ہاشم قبائل مکہ میں سے کسی بھی قبیلے سے زیر نہیں تھے، چنانچہ ابوجہل لاکھ کوشش کے باوجود اپنے قبیلہ کو آپ ﷺ کے قبیلے سے برتر ثابت نہیں کر سکا۔

چلتے چلتے ایک مشہور مستشرق مارکیولوس کے ان ہفوات کا بھی جائزہ لے لیا جائے جو اس کے قلم سے آپ ﷺ کی خاندانی شرافت کو داغ دار ثابت کرنے کے لیے معرض تحریر میں آئے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ: "محمد ایک غریب اور ادنی خاندان سے تھے۔"

اس دعویٰ کی دلیل میں موصوف نے چند باتیں پیش کی ہیں:

(۱) قرآن مجید میں ہے کہ قریش کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا۔

(۲) پیغمبر کے عروج کے زمانے میں قریش نے آپ ﷺ کو اس درخت سے تشبیہ دی جو گھورے پر جمتا ہے۔

(۳) رسول پاک ﷺ کو جب ایک شخص نے مولیٰ کہہ کر مخاطب کیا تو آپ نے اس لقب سے انکار کیا۔

(۴) فتح مکہ کے دن آپ نے فرمایا کہ آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہو گیا۔

مذکورہ بالا استدلالات کا جواب معروف سیرت نگار مولانا شبلی نعمانی نے یوں دیا

۱۔ سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۳۳۸، ۳۳۷۔

ہے:

”قرآن شریف کے الفاظ یہ ہیں:

“قالوا لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم”

یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں مکہ وطائف کے کسی رئیس پر کیوں نہ اترا، عظیم اور شریف دو الگ الگ لفظ ہیں، قرآن میں عظیم کا لفظ ہے، اہل عرب دولت واقتدار والے کو عظیم کہتے تھے، ان کو آنحضرت ﷺ کی شرافت سے نہیں بلکہ جاہ و دولت سے انکار تھا۔

دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن کی ہر بات کو صحیح ماننا چاہیے، کفار نے تو آنحضرت کو دیوانہ، جادو زدہ، شاعر سب کچھ کہا، ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

بلاشبہ آنحضرت ﷺ نے مولیٰ اور سید کے لفظ سے انکار کیا، لیکن متعدد حدیثوں میں اس بات کی تصریح ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو سید اور مولیٰ نہ کہو مولیٰ اور سید خدا ہے، قرآن میں ہر جگہ خدا ہی کو مولیٰ کہا گیا ہے، اس سے آنحضرت ﷺ کی خاندانی شرافت کا ابطال کیوں کر ہو سکتا ہے؟

اخیر استدلال بھی حیرت انگیز ہے، اس سے آنحضرت ﷺ کی کم نسبی کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے کہ شرفائے مکہ سے یہاں مراد جبارین و متکبرین مکہ ہیں۔(۱)

❁❁❁

۱۔ ملخصا۔ سیرۃ النبی: حصہ اول: حاشیہ نمبر: ۱۱۸۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق عالیہ اور مستشرقین

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"(۱)

میری بعثت اس لیے ہوئی ہے تاکہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں۔"

ظاہر ہے جس کی بعثت کا مقصد ہی اخلاق حسنہ کی تکمیل ہو اگر وہ خود ان اخلاق کا جامع نہیں ہوگا تو وہ اتنے عظیم فریضہ سے کیسے سبک دوشی حاصل کر سکے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جب ہم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک ایک ورق اٹھا کر مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کی پوری زندگی اخلاق حسنہ کی حسین جلوہ گاہ نظر آتی ہے، تقویٰ وطہارت، عفت وعصمت، توکل واستغنا، عفو ودرگزر، حلم ووقار، عزت وتمکنت، رحمت ورافت غرض کہ اخلاق طاہرہ کا وہ کون سا پہلو ہے جو آپ کے اندر نہیں پایا جاتا ہے خود قرآن مقدس ارشاد فرماتا ہے:

"وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (القلم:۴)

بلاشبہ آپ خلق عظیم پر فائز ہیں۔

قرآن کی مذکورہ بالا آیت ہی سرکار کے خلق عظیم کی سب سے بڑی دلیل ہے، ذرا انداز بیان ملاحظہ فرمائیں، اسی کو سادے انداز میں "وان لك خلقا عظیما" بھی کہا جا سکتا تھا، مگر آیت کریمہ کو کئی تاکیدوں کے ساتھ موکد کیا گیا ہے اولاً جملہ اسمیہ ہے، ثانیاً اِنّ حرف مشبہ بالفعل برائے تحقیق ہے، ثالثاً لام تاکید کا استعمال کیا گیا ہے، رابعاً خلق کے اندر ویسے ہی عظمت کے معنی ہیں، اس کے باوجود عظیم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، خامساً "علیٰ" حرف جر کا استعمال ہے، جو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ سرکار کے قبضے میں اخلاق حسنہ اس طرح سے تھے

۱۔ موطا امام مالک، ص: ۷۵۷۔

جیسے کہ سوار کے قبضہ میں سواری ہوتی ہے گویا آپ جب چاہتے ان کو اپنی مرضی مبارک سے استعمال فرماتے تھے۔

اور آگے بڑھیں اور آپ کے اخلاق حسنہ کی شہادت آپ کی محرم راز اور سب سے عزیز زوجہ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں، آپ سے سرکار ﷺ کے اخلاق حسنہ سے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

"كان خلقه القرآن" (۱)۔ حضور ﷺ کا خلق قرآن تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو رحمت عالم ﷺ کی زوجہ محترمہ اور آپ کی نہایت چہیتی بیوی تھیں، انھوں نے آپ ﷺ کے حسن اخلاق کی سند ان الفاظ میں عطا کی ہے:

"انك لتصل الرحم وتحمل الكلّ وتكسب المعدوم وتقري الضيف وتعين على نوائب الحق" (۲)

آپ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مفلسوں کو اپنی کمائی سے حصہ دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، حق کے ناتے کسی کو پریشانی لاحق ہو تو آپ اس کی مدد فرماتے ہیں۔

تقریبا دس سال تک خدمت اقدس میں رہنے والے ایک جانثار صحابی انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"میں نے لگاتار دس سال تک حضور کی خدمت کی، حضور نے مجھے کبھی اف تک نہیں کہا۔"

قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں کہ رحمت عالم ﷺ کے حسن اخلاق کی شہادت وہ نفوس قدسیہ دے رہے ہیں جنھوں نے اپنے ماتھے کی آنکھوں سے آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحہ کا مشاہدہ کیا ہے، آپ کی صبح دیکھی، آپ کی شام دیکھی ہے، آپ کا سونا دیکھا ہے، آپ کا جاگنا دیکھا ہے، آپ کو تنہا دیکھا ہے آپ کو مجمع میں دیکھا ہے، اتنے قریب سے دیکھنے والوں کو آپ اخلاق حسنہ اور بہترین کیرکٹر و کردار کا نمونہ نظر آئے، مگر صدیاں بیت جانے کے

۱۔ ضیاء النبی: ۵/ ۳۲۲، مطبع سابق۔

۲۔ رواہ البخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ: رقم الحدیث: ۳۔

بعد یورپ و امریکہ کے ریزہ خوار مستشرقین نے نہ جانے کون سی آنکھ سے دیکھا کہ آپ ﷺ ان کی نظر میں تمام عادات مذمومہ اور اوصاف غیر محمودہ کا جامع نظر آئے، آپ ﷺ ان شر پسندوں کو جھوٹا، مکار، راہزن، اور نہ جانے کیا کیا نظر آئے، کیا کوئی انصاف پسند مستشرقین کو یہ بتلا سکتا ہے کہ وہ عیوب جن کو انھوں نے آپ کی طرف منسوب کیا ہے کیا ہمیشہ اور رات دن آپ کی خدمت میں رہنے والی ازواج مطہرات اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم کو کیوں نہیں نظر آئے؟ کوئی ایسی روایت پیش کی جائے جس میں رحمت عالم ﷺ کی بدخلقی کا ذکر موجود ہو، مجھے بتایا جائے کہ اگر آپ علیہ السلام بداخلاق ہی ہوتے تو گنے چنے چند برسوں میں عرب اور پوری دنیا کے اندر جو عظیم اسلامی انقلاب برپا ہوا یہ کسی ایسے شخص کے دم قدم کا رہین منت ہو سکتا ہے جس کے اخلاق گندے ہوں، جو جھوٹا، دغا باز اور عیاش ہو! وہ اسلام دشمن جو عہد نبوت میں تھے انھوں نے آپ کے اخلاق و کردار پر کبھی انگشت نمائی نہیں کی چنانچہ ابوجہل نے سرکار کی صداقت کی گواہی دیتے ہوئے کہا:

"واللہ ان محمدا لصادق وما کذب محمد قط۔" (۱)

باخدا محمد (ﷺ) سچے ہیں، انھوں نے کبھی کذب گوئی نہیں کی۔

"انا لا نکذبک ولکن نکذب بما جئت" (۲)

ہم تمھاری تکذیب نہیں بلکہ تمھارے پیغام کی تکذیب کرتے ہیں۔

ابوسفیان ہرقل کے دربار میں لاکھ کوشش کے باوجود کوئی ایسی عیب دار چیز نہیں پا سکے جو آفتاب نبوت کے خلاف استعمال کرتے۔

مجھے بتایا جائے کہ اگر آپ ﷺ بداخلاق ہوتے تو کیا ان کے عہد کے یہ دشمنان دین آپ کے اخلاق پر انگشت نمائی نہیں کرتے، کیا حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم جیسے دیدہ ور حضرات آپ کے ارد گرد جمع ہوتے؟

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ بداخلاق انسان کے لیے کبھی کوئی اپنے دل کا دروازہ نہیں وا کرتا ہے مگر مشاہدہ گواہ ہے کہ اسی خاکدان گیتی پر تقریباً چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ سے

۱۔ شفا شریف: ۱/۱۷۳۔

۲۔ السیرۃ النبویۃ: ۲/۲۷۶۔

رحمت عالم ﷺ کروڑوں مسلمانوں کے دلوں پر راج کر رہے ہیں، اور ہر ایک انسان ان کو اپنے نہاں خانہ دل کی زینت سمجھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرکار ﷺ کی ذات ایک شفاف آئینہ کی مانند ہے ہر کوئی آپ کی ذات میں اپنے ہی اخلاق و کردار کا عکس دیکھتا ہے، جو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کو آپ کے اندر اوصاف حمیدہ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے اور جو تعصب کی نگاہ سے دیکھتا ہے اسے آپ کا ہر فعل اور ہر عمل بداخلاق کے رنگ میں نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ابوجہل وابولہب نے آپ کو دیکھا تو آپ کی ذات میں انھیں اپنے اخلاق و کردار کی جھلک ملی، مگر جب حضرت ابوبکر وعمر نے دیکھا تو آپ کے اندر انھیں اپنے اخلاق و کردار کی جھلک نظر آئی، اور آج کے مستشرقین آج ایک بار پھر ابوجہل وابولہب کی نگاہ سے آپ ﷺ کی ذات کو دیکھ رہے ہیں تو آپ کی ذات کے اندر ان کو اپنے گندے اخلاق و کردار کا عکس صاف دکھائی دے رہا ہے گویا وہ آپ کی ذات کے عیوب کو نہیں بلکہ اپنی ذات کے عیوب کو دیکھ رہے ہیں۔

آیئے ذیل میں ہم مستشرقین کی تحریروں کے چند اقتباسات آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ دریدہ دہن مستشرقین آپ کے اخلاق کے تعلق سے کیا زہر افشانی کرتے ہیں۔واضح رہے کہ مستشرقین کے اقوال انگریزی زبان میں ہیں اور میں انگریزی زبان پر کماحقہ قدرت نہیں رکھتا ہوں، اس لیے کتاب ضیاء النبی سے ان اقوال کا اردو ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔

ٹار انڈرائے حضور ﷺ کے اخلاق کے متعلق یوں زہر افشانی کرتا ہے:

”مذہبی راست بازی، اپنے مشن سے وفاداری، ثابت قدمی، روشن دلی اور سخاوت وغیرہ جو باتیں محمد ﷺ کے دفاع میں کہی جاسکتی ہیں، ان سب کے باوجود یہ کہنا پیغمبر اسلام سے ناانصافی نہ ہوگی کہ ان کے اخلاق کا معیار وہ نہیں جو ان کی دیگر خوبیوں اور صلاحیتوں کا ہے بلکہ ان کی اخلاقی شخصیت ان کی مذہبی شخصیت کے ہم پلہ بھی نہیں ہے، لیکن محمد ﷺ کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم عیسائی محمد ﷺ کا مقابلہ اس بے مثال اور عظیم الشان شخصیت کے ساتھ کرنے کا رجحان رکھتے ہیں جو

ہمیں انجیلوں میں نظر آتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہم محمد ﷺ کے اخلاق کو اس کامل اخلاقی معیار پر پرکھیں جو ان کے پیروکاروں کی عقیدت نے ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لیے قائم کر رکھا ہے، ظاہر ہے جب معیار اتنا بلند ہوگا تو وہ کون سی شخصیت ہوگی، جس میں خامیاں نظر نہیں آئیں گی۔"(۱)

مندرجہ بالا اقتباس میں ٹارانڈرائے نے یہ شگوفہ چھوڑا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں، ایک مذہبی شخصیت دوسرے اخلاقی شخصیت، مذہبی شخصیت کا معیار تو بہت اونچا ہے، جب کہ اخلاقی شخصیت کا گراف بہت نیچا ہے، اور یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے کیوں کہ ہم نبی کریم ﷺ کی اخلاقی شخصیت کا موازنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی شخصیت سے کرتے ہیں، یا آپ کی ذات کو اس اخلاقی معیار پر تولتے ہیں جو آپ ﷺ کے متبعین اور عقیدت کیشوں نے بڑھا چڑھا کر قائم کر رکھا ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس میں ٹارانڈرائے نے بھلے ہی نبی کریم ﷺ کے اخلاقی معیار کی سطح کو کافی نیچی دکھانے کی کوشش کی ہے تاہم اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اخلاقی اقدار کا سب سے بڑا نقیب اور اوصاف حسنہ کا سب سے بڑا علم بردار شمار کیا ہے اتنا بڑا کہ ان کے سامنے نبی کریم ﷺ کا اخلاقی قد کافی چھوٹا نظر آتا ہے، اب آیئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان ہی سے اپنے آقا کے اخلاق کی ثنا خوانی ملاحظہ کریں فرماتے ہیں:

"مجھے تم سے بہت ساری باتیں بھی کہنی ہیں، لیکن فی الحال تم ان باتوں کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہو، تاہم جب وہ تشریف لائے گا جو سچائی کی روح ہے تو وہ تمھیں سچائی کی سب باتیں بتائے گا۔"(۲)

وہ سچی باتیں کیا ہوں گی ان کو بھی انجیل کے اسی باب میں دیکھتے چلیں، ارشاد ہے:
"اور جب وہ تشریف لائے گا تو وہ دنیا کو نیکی، بدی اور عدل کے متعلق متاثر کن شہادت فراہم

۱۔ محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ: ص:۱۹۱، مطبع سابق۔

۲۔ انجیل یوحنا: باب: ۱۶: آیات: ۱۲، ۱۳۔

کرے گا۔"(۱)

نیکی کا حکم دینا، بدی سے روکنا، اور عدل ومساوات کا درس دینا یہ سب باتیں اخلاقی تعلیمات ہی کے دائرے میں آتی ہیں۔

پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس عظیم شخصیت کو اخلاق کا عظیم معلم قرار دیں وہ خود اخلاق اور اوصاف حسنہ سے عاری ہو؟ ایسا بھی نہیں کہ اخلاق کے اس عظیم معلم کی تعلیمات رائگاں چلی گئیں تھیں، بلکہ آپ کے پیروکاروں میں اس تعلیم کا خاطر خواہ اثر بھی نمایاں تھا چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اخلاق کی تین سو ساٹھ صورتیں ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ کیا ان میں سے کوئی صورت میرے اندر موجود ہے؟ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"کلها فیك یا ابابکر"(۲)-اے ابوبکر سب کی سب تمھارے اندر موجود ہیں۔

تعجب ہے کہ جس عظیم ذات کے ایک غلام کے اندر اخلاق کی تمام شاخیں پھل پھول رہی ہوں خود اسی کے اخلاق کا معیار بہت نیچا ہے؟

ٹارانڈرائے کا یہ بہتان بھی غلط ہے کہ مسلمانوں نے اپنے نبی کے اخلاق کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے کیوں کہ آپ کے اخلاق عالیہ کا شہرہ اہل عرب میں اس وقت بھی تھا جب آپ نے اپنی نبوت کا اعلان بھی نہیں کیا تھا، چنانچہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے سامنے جو خطبہ دیا تھا اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

"فکنا علی ذالك حتی بعث الله الینا رسولامنا نعرف نسبه وصدقه وامانته وعفافه"(۳)

مذکورہ بالا الفاظ اس بات پر شاہد ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کی خوشبو سے پورا عالم اس وقت بھی معطر تھا جب آپ کی عقیدت کیش امت کا وجود ہی نہیں

۱۔ انجیل: یوحنا، باب:۱۶: آیت:۸۔

۲۔ ضیاء القرآن: ۵/۳۳۵، مطبع سابق۔

۳۔ سیرۃ ابن ہشام: ص:۳۳۶، مطبع سابق۔

تھااور آپ کے اخلاق کی شہرت اعلان نبوت کے پہلے بھی تھی پھر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ جس ذات کے اخلاق کا شہرہ اپنوں اور غیروں میں یکساں طور سے ہو اس کے تعلق سے یہ الزام لگایا جائے کہ اس کے اخلاق کو اس کے عقیدت مندوں نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا، یہ ضرورت تو اس وقت پیش آتی جب آپ کی بداخلاقی مشہور ہوتی تا کہ آپ کے اخلاق کو گڑھ کر پھیلا دیا جائے اور اس طرح آپ کی بداخلاقی چھپ جائے۔

رسول پاک ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار" (۱)

جس نے دانستہ طور سے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے، اس حدیث کے ہوتے ہوئے کون مسلمان جرأت کرسکتا ہے کہ رسول پاک ﷺ کے تعلق سے جھوٹے اخلاق وعادات کو آپ کی طرف منسوب کرے؟

ہجرت کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک چھوٹا سا مسلح دستہ نخلہ کی جانب روانہ فرمایا اتفاق سے کفار سے مدبھیڑ ہوگئی اور اس میں ایک آدمی قتل ہوا، جب کہ دو آدمی قیدی بنائے گئے، جب یہ فوجی دستہ سرکار ﷺ کے پاس واپس آیا، تو سرکار ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے صحابۂ کرام کو متنبہ کیا، اس کی دو وجہ تھی ایک تو یہ کہ جس دن یہ واقعہ رونما ہوا تھا وہ ماہ رجب کا دن تھا اور ماہ رجب حرمت کا مہینہ ہے، دوسرے یہ کہ سرکار ﷺ نے صحابہ کو کفار کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجا تھا مگر غیرت ایمانی اور پرانے مظالم نے ان کو لڑائی پر آمادہ کردیا اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹارانڈرائے کہتا ہے:

"جس بات پر ہمیں غصہ آتا ہے وہ ان کی وہ عیاری ہے جس سے انھوں نے عبداللہ کو ایک کام پر ابھارا لیکن اس کام کے نتائج کے متعلق کسی قسم کی ذمہ داری کو قبول نہ کیا۔" (۲)

مزید لکھتا ہے:

۱۔ مسلم شریف: ۱/۴۹۱۔

۲۔ محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ، ص: ۱۴۳، مطبع سابق۔

''یہ واقعہ ان کے کردار کی ایک خصوصیت کو منکشف کرتا ہے جو خصوصی طور پر گوری قوموں کے معیار مردانگی پر پوری نہیں اترتی ہے، وہ کھلے عام اپنی رائے کا دفاع کرنے کی ہمت سے عاری ہیں، جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ دھوکہ دینے اور حیلے بہانے سے مفاد حاصل کرنے کا رجحان رکھتے ہیں، اور اپنے موقف کی کھلے عام حمایت کرنے سے کتراتے ہیں۔''

اس غلط نظریے کی تردید سے قبل آپ اختصار کے ساتھ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا پورا واقعہ ملاحظہ فرمالیں:

ہجرت کے دوسرے سال نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے ساتھ کچھ صحابہ کرام کو قریش کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کے لیے بھیجا، ان کو ایک تحریری فرمان دیا اور حکم دیا کہ اس کو دو دن بعد کھولنا، دو دن بعد وہ حکم نامہ کھول کر پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا کہ جب تم میرا خط پڑھو تو سفر جاری رکھو اور نخلہ پہونچ کر قریش کی نقل وحرکت پر نظر رکھو، اور ان کے حالات سے ہمیں باخبر رکھو۔

تمام صحابہ سوائے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کے نخلہ کی جانب جادہ پیماں ہوگئے، اور وہاں پہونچ کر اپنے کام میں لگ گئے، اتفاق سے ادھر ہی سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ عمرو بن حضرمی کی قیادت میں گذرا، صحابہ کرام نے ان کو دیکھا تو ان کی نگاہوں میں وہ سارے مظالم ومصائب پھر گئے جنھیں ان قریشیوں نے ان پر توڑے تھے، باہم مشورہ کے بعد سب نے اس قافلہ پر حملہ کردیا، عمرو بن حضرمی مارا گیا اور دو لوگ گرفتار ہوگئے یہ واقعہ رجب کی آخری تاریخ کو پیش آیا، فتح کے بعد فرحاں وشاداں صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور مال غنیمت کا خمس بارگاہ نبوت میں نذر کرنی چاہی، سرکار ﷺ نے لینے سے انکار فرمادیا، اور فرمایا: ''میں نے تمھیں حرمت والے مہینوں میں قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔'' آپ کے اس جواب سے صحابہ کرام کو بڑی تکلیف ہوئی، ادھر کفار قریش اور یہودیوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ نبی کریم ﷺ نے حرمت والے مہینے میں جنگ نہ کرنے کے مسلمہ اصول کو توڑ دیا، جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو قرآن پاک کی یہ آیت اتری:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ

[البقرۃ:۲۱۷]

وہ پوچھتے ہیں کہ حرام مہینے میں جنگ کا کیا حکم ہے، آپ فرما دیجیے کہ اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کی راہ سے روک دینا، اس کے ساتھ کفر کرنا، مسجد حرام سے روک دینا اور اس کے باشندوں کو اس سے نکال دینا اس سے بھی بڑا گناہ ہے، اور فتنہ وفساد قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔

اس آیت مبارکہ نے شرپسند قریشیوں اور یہودیوں کا ناطقہ بند کر دیا نبی کریم نے ان صحابہ کرام کی طرف سے خمس اور دونوں قیدیوں کو قبول فرمالیا، اور دونوں قیدیوں کے بدلے میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کو قریش کے قبضہ سے رہا کرالیا۔

مذکورہ بالا واقعہ آپ کے سامنے ہے مجھے فیصلہ کر کے بتائیں کہ اس واقعہ میں کہاں سے اور کس کڑی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عیاری ثابت ہورہی ہے، اگر حرمت والے مہینے میں جنگ کرنا حرام تھا تو اس کی ذمہ داری خود جنگ کرنے والے صحابہ کرام پر عائد ہوگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تو اس سے بری ہے، اور اکثر مورخین نے تو یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مجاہدین نے یہ جنگی کارروائی اس ناتے کی تھی کہ ان کے خیال میں شعبان کا چاند طلوع ہو کر شعبان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، اگر ان کی بات صحیح ہو تو پھر مجاہدین پر بھی کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا ہے، اگر چاند واقعی طلوع ہو چکا تھا تب تو کوئی بات ہی نہیں اور اگر نہیں تو پھر اس کو ایک اجتہادی لغزش پر محمول کر سکتے ہیں۔

رہی بات کہ سرکار نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیوں فرمایا تو اس کی وجہ صاف ہے کہ صحابہ کرام کو آپ نے صرف نقل وحرکت کی دیکھ ریکھ کے لیے روانہ فرمایا تھا جب کہ صحابہ کرام کی غیرت ایمانی نے ان کو آپ کا یہ حکم بھلا دیا اور جنگی کارروائی کر بیٹھے، ایسے میں سرکار کا تنبیہ کے لیے ناراض ہونا ضروری تھا تا کہ آئندہ اس طرح کا اقدام نہ ہوسکے، دوسری بات یہ

بھی ذہن میں رہے کہ صحابہ کرام کی یہ کارروائی مشہور روایت کے مطابق حرمت والے مہینے میں تھی اور حرمت والے مہینے میں تمام اہل عرب جس میں مسلمان بھی شامل تھے، سب اس مہینے میں جنگ نہیں کرتے تھے، اب صحابہ کرام نے دانستہ یا غیر دانستہ طور سے اس میں جنگ کر کے دشمنان دین کے لیے اسلام اور مسلمانوں پر اعتراض کا باب وا کر دیا تھا، اس لیے سرکار نے ان سے اظہار ناراضگی فرمایا چنانچہ جب آیت کریمہ اتری تو آپ صحابہ کرام سے راضی بھی ہو گئے۔

اس واقعہ سے آپ ﷺ کی عیاری تو اس وقت ثابت ہوتی، جب آپ صحابہ کرام کو جنگ کا حکم دیتے اور پھر اس کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے کر خود مجاہدین ہی پر ڈال دیتے، جب کہ معاملہ ایسا نہیں، ابھی آپ نے اصل واقعہ میں پڑھا کہ سرکار نے جو مکتوب دیا تھا، اس میں جنگ کا بالکل ذکر نہیں تھا، اس میں صرف نقل وحرکت کی نگرانی کا حکم تھا، لیکن صحابہ کرام نے جنگ کی، تو اب سرکار اس کی ذمہ داری اپنے سر کیوں کر لیتے؟ بالفرض اگر اس تحریری حکم نامے میں جنگ کا حکم دیا گیا ہوتا تو وہ تحریر حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھی، اس کو دکھا کر وہ اپنی براءت ظاہر کر لیتے، مگر ایسا نہ ہوا، تو ثابت ہوا کہ اس واقعہ کو لے کر حضور ﷺ کے دامن پر اعتراض کرنے والا متعصب اور ہٹ دھرم تو ہو سکتا ہے ،منصف اور حقیقت پسند نہیں ہو سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے گھر والوں کو دعوت اسلام دی، سب نے انکار کیا، سوائے چند نفوس قدسیہ کے قرآن نے ان کے اس معاندانہ حرکت اور دعوت دین کے نہ قبول کرنے پر ان کی خوب مذمت کی اور فرمایا کہ یہ بات عقل مندی سے کافی دور ہے کہ تم بھی اپنے باپ دادا کی طرح بت پرستی کر کے جہنم کا سودا کرو۔

مستشرقین نے اس بات کو بھی لے کر سرکار کے دامن اخلاق کو داغ دار کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے چنانچہ منٹگمری واٹ نے کہا:

''یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ کفار اسلام قبول نہ کرنے کا بہانہ یہ بناتے تھے کہ وہ دین آبا پر قائم ہیں، آبائی روایات کا علمبردار ہونے اور مذہبی صداقت کا مخالف ہونے کی وجہ سے آباواجداد پر قرآن حکیم جو حملے کرتا ہے ممکن ہے ان حملوں کے پیچھے

محمد ﷺ کی وہ لاشعوری تلخی کارفرما ہو جوان کے دل میں اس وجہ سے پیدا ہوگئی تھی کہ ان کے آباواجداد نے بچپن میں انھیں بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا۔"(۱)

اولاتو میں منٹگمری واٹ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ نے کون سی دلیل اور کہاں سے یہ لکھ دیا کہ سرکار کے آباواجداد نے ان کو بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا، جس بچے پر دادا عبدالمطلب جان چھڑکتے ہوں، جس بچے کو شیرخوارگی کے ایام میں حلیمہ سعدیہ جیسی مشفق خاتون ملیں، جس بچے کی نصرت وحمایت کے لیے ابوطالب جیسے بااثر آدمی نے پورے عرب سے جھگڑا مول لیا، جس بچے کو ابوطالب کے فرزندوں نے اپنا بھرپور تعاون پیش کیا ہو کیا اس کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ سرکار کو ان کے آباواجداد نے بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا، جس کے ناتے ان کے دل میں اپنے آباواجداد سے نفرت پیدا ہوگئی تھی۔

ابوطالب کے تعلق سے سرکار کے دل میں کتنی محبت تھی اس کا اندازہ آپ اس امر سے لگایئے کہ جب ان کے انتقال کا وقت قریب آیا تو سرکار نے ان سے ایمان لانے کو کہا مگر ابوطالب کی غیرت قومی نے ان کو ایمان کی دولت سے محروم رکھا، پھر سرکار ﷺ کے دل میں آپ کی خیر خواہی اور آپ کی محبت کا جذبہ کس حد تک تھا، اس کا اندازہ آپ ذیل کے الفاظ سے لگایئے فرماتے ہیں:

"واللہ لاستغفرن لک مالم أنہ عنک"(۲)

باخدا جب تک اللہ تعالیٰ مجھے منع نہیں فرمائے گا میں آپ کے لیے مغفرت طلب کرتا رہوں گا۔

کیا یہی ایک واقعہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ سرکار کو اپنے آباواجداد سے اتنی محبت تھی کہ آپ ہمیشہ ان کی خیر خواہی کے جذبے سے لبریز رہتے تھے، اور چاہتے تھے کہ میرے اہل قرابت جہنم کی ہولناکیوں سے بچ جائیں، ایسے میں منٹگمری واٹ کا یہ کہنا کہ آپ کے دل میں اپنے آباواجداد سے نفرت کا جذبہ موجود تھا صریح جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے؟

۱۔ محمد ایٹ مکہ، ص: ۴۸، مطبع سابق۔

۲۔ مسلم شریف: ۱/۴۰۔

وہ مقدس ذات جس نے باپ ماں کو اف تک کہنے سے منع کرے بھلا وہ ان سے نفرت کا سلوک کیسے کرسکتی ہے؟

رحمت عالم ﷺ کے دامن اخلاق پر مستشرقین نے کیچڑ اچھالتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ آپ کے اندر بدعہدی اور وعدہ خلافی جیسے ذلیل عیوب پائے جاتے تھے چنانچہ منٹگمری واٹ اس سلسلے میں لکھتا ہے:

''محمد (ﷺ) نے کفار مکہ کے ساتھ کیے جانے والے حدیبیہ کے معاہدے کو بھی توڑا تھا اور یہودیوں سے آپ نے جو معاہدے کئے تھے، ان کو توڑنے کے ذمہ دار بھی آپ ہی تھے۔''(۱)

اگر بار خاطر نہ ہو تو صلح حدیبیہ میں جو قریش اور سرکار دوعالم ﷺ کے درمیان تحریری معاہدہ ہوا تھا، اس کو ملاحظہ فرمالیں:

"باسمك اللهم هذا ما اصطلح عليه محمد بن عبدالله وسهيل بن عمرو، اصطلحا على وضع الحرب عشر سنذين، يامن فيها الناس، ويكف بعضهم عن بعض، على انه لا اسلال ولا اغلال، وان بيننا عيبة مكفوفة، وانه من احب ان يدخل فى عهد قريش وعقدها فعل، وانه من اتى محمدا منهم بغير اذن وليه رده محمد اليه، وانه من اتى قريشا من اصحاب محمد لم یردوه، وان محمد ا يرجع عنا عامه هذا باصحابه ويدخل علينا من قابل فى اصحابه ويقيم بها ثلاثا، ولا يدخل علينا بسلاح الاسلاح المسافر، السيوف فى القرب"(۲)

اے اللہ! تیرے نام سے، یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو نے صلح کی ہے، انھوں نے اس بات پر صلح کی ہے کہ اس سال تک فریقین میں جنگ نہیں ہوگی، لوگ امن سے رہیں گے اور کوئی کسی دوسرے پر دست درازی نہیں کرے گا، کوئی چوری اور خیانت نہیں کرے گا، ہم ایک دوسرے کے راز افشا نہیں کریں گے، اور جس قبیلہ کی

۱۔ محمد ایٹ مدینہ: ص: ۳۲۷، مطبع سابق۔

۲۔ امتاع الاسماع: ۱؍۲۲۷ بحوالہ ضیاء النبی: ۷؍۱۴۲، مطبع سابق۔

مرضی ہو، وہ محمد ﷺ سے معاہدہ کرے، اور جس کی مرضی ہو وہ قریش کے ساتھ معاہدہ کرلے، مکہ میں سے جو شخص اپنے ولی کے اذن کے بغیر محمد (ﷺ) کے پاس آئے گا، تو آپ اسے واپس کردیں گے اور اگر حضور کے اصحاب میں سے کوئی قریش کے پاس آئے گا تو وہ واپس نہیں کریں گے اور محمد ﷺ اپنے صحابہ سمیت واپس چلے جائیں، آئندہ اپنے صحابہ سمیت عمرہ ادا کرنے آئیں گے، اور مکہ میں تین روز قیام کریں گے، اور تلوار کے علاوہ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوگا، اور تلواریں بھی نیاموں میں بند رہیں گی۔

اس معاہدے کی رو سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کوئی بھی فریق کسی پر حملہ کرکے ایذا نہ پہونچائے اور نہ ہی کسی کو یہ حق ملنا چاہیے تھا کہ وہ دوسرے فریق کے کسی حلیف پر دست درازی کرکے اپنے مقابل فریق کو جنگ پر آمادہ کرے، مگر صلح حدیبیہ کے ۲۲ ماہ بعد خود قریش نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کے حلیف قبیلۂ بنو خزاعہ کے خلاف بنوکنانہ اور بنوبکر کی مدد کی اور صرف جنگ میں مدد ہی نہیں کی بلکہ بنفس نفیس صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، شیبہ بن عثمان جیسے روسائے قریش نے باقاعدہ اس جنگی مہم میں بنوکنانہ کا ساتھ دیا جو بنوخزاعہ کے خلاف بنوکنانہ نے لڑی، قریش اور بنوکنانہ دونوں نے مل کر بنوخزاعہ کے بوڑھوں، بچوں اور ضعیفوں کا قتل عام کیا اور حدود حرم میں بھی ان بے چاروں کا خون بہا کر اپنی شقاوت قلبی کا ثبوت دیا، ظاہر ہے یہ قریش کی طرف سے صلح حدیبیہ میں طے شدہ معاہدہ کی صریح خلاف ورزی تھی، چنانچہ دوراندیش قریش نے بھی اس بات کو بڑی سنجیدگی سے لیا اور حارث بن ہشام اور عبداللہ بن ابی ربیعہ جیسے معزز سرداروں نے صفوان اور عکرمہ سے مل کر اس بات کا اظہار بھی کیا کہ تم نے اس معاہدہ کو توڑ دیا جو سرکار ﷺ کے ساتھ طے پایا تھا، اس عہد شکنی کے نتائج بھگتنے کے لیے اب تیار ہو جاؤ۔" (۱)

بنوکنانہ کے ساتھ مل کر بنوخزاعہ کا قتل عام کرنا یہ معاہدے کی صریح خلاف ورزی تھی، جس کے مرتکب خود قریش تھے، ان تاریخی حقائق کے سامنے منٹگمری واٹ کے اس بکواس کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے "محمد (ﷺ) نے کفار مکہ کے ساتھ کئے جانے والے حدیبیہ کے معاہدے کو بھی توڑا تھا؟"

۱۔ سبل الہدیٰ: ۵/۳۵۔۳۶۔

خود صلح حدیبیہ کے اندر دو ایسے واقعات موجود ہیں، جو منٹگمری واٹ کے مذکورہ نظریے کی تردید کے لیے کافی ہیں، چنانچہ جس وقت معاہدے کی تحریر لکھی جا رہی تھی، اسی وقت کفار کے نمائندے سہیل بن عمرو کا لڑکا ابو جندل جو مسلمان ہو چکا تھا اور جس کو زنجیروں میں جکڑ کر عذاب دیا جا رہا تھا، کسی طرح وہ اسی اثنا میں سرکار کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اپنی دستگیری کی گذارش کی، سہیل نے ابو جندل کو دیکھتے ہی اس کو مارنا شروع کر دیا اور کہا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پہلا آدمی ہے، اس کی واپسی کا میں آپ سے مطالبہ کرتا ہوں، سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل سے کہا کہ ابو جندل کو میرے پاس رہنے دیجیے، سہیل نے کہا کہ اگر میرے بیٹے کو واپس نہیں کریں گے تو میں معاہدہ کو کالعدم قرار دے دوں گا، سرکار نے ابو جندل سے فرمایا:

"یا اباجندل اصبر واحتسب، فان اللہ جاعل لک لمن معک من المستضعفین فرجا ومخرجا، فانا قد عقدنا مع القوم صلحا واعطیناھم واعطونا علی ذالک عھدا و"انا لا نغدر"(۱)

اے ابو جندل صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھو، یقیناً اللہ تعالیٰ تیرے اور تیرے کمزور ساتھیوں کے لیے نجات کا راستہ بنانے ہی والا ہے، ہم نے قوم کے ساتھ صلح اور عہد و پیمان کیا ہے، اب ہم عہد شکنی نہیں کر سکتے۔

خط کشیدہ عبارت کو پھر پڑھ لیں اور بتائیں کہ جس صادق و وفا شعار انسان کا نظریہ یہ ہو بھلا وہ عہد شکنی اور بد عہدی جیسے بھیانک گناہ کا ارتکاب کیسے کر سکتا ہے؟

یوں ہی ابو بصیر رضی اللہ عنہ نامی صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں اپنے گھر والوں کی عقوبت رسانی اور تعذیب سے تنگ آ گئے تو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کرم میں پناہ گزینی کے لیے مدینہ طیبہ پہونچے، مگر ان کے گھر والوں نے آپ کے نام یہ خط بھیجا کہ معاہدے کی رو سے آپ ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیں، سرکار نے ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے جو بات کہی تاریخ میں وہ اب تک محفوظ ہے:

"یا ابا بصیر انا قد اعطینا ھؤلاء القوم ما قد علمت ولا یصلح لنا فی

۱۔ امتاع الاسماع: ۱/۲۲۶؛ دار الانصار، قاہرہ: ۱۹۸۹ء۔

دیننا الغدر وان اللہ جاعل لك ولمن معك من المسلمین فرجاً و مخرجاً"(۱)

اے ابوبصیر! تم جانتے ہو کہ ہم نے اس قوم کے ساتھ معاہدہ کیا ہے، اور ہمارا دین ہم کو عہد شکنی کی اجازت نہیں دیتا، اور بیشک اللہ تعالیٰ تمھارے اور تمھارے مسلمان ساتھیوں کے لیے نجات کا راستہ ہموار کرنے والا ہے۔

خط کشیدہ عبارت منٹگمری واٹ کے چہرے پر ایک زبردست طمانچہ ہے، جو سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کو بدعہد ثابت کر رہا ہے۔

رہا منٹگمری واٹ کا یہ کہنا کہ یہودیوں سے کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کے ذمہ دار بھی آپ ہی تھے، تو یہ سراسر جھوٹ ہے، چنانچہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے، اس وقت تمام یہودیوں سے معاہدہ کیا جس کے چند اہم دفعات یہ تھے:

(۱) ہر فریق دوسرے فریق سے دھوکا اور غدر نہیں کرے گا۔

(۲) وہ دشمن کے لیے جاسوسی نہیں کریں گے۔

(۳) وہ دشمن قبائل کی مدد نہیں کریں گے۔

(۴) وہ کسی پر دست تعدی دراز نہیں کریں گے۔(۲)

دفعہ نمبر ا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قبیلۂ بنو نضیر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی، چنانچہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم دو مقتولوں کے خون بہا کی ادائگی کے لیے جب بنو نضیر کے یہاں تشریف لے گئے تو ان بدبختوں نے آپ کے ساتھ غداری کی اور عمرو بن حجاش نامی ایک شخص کو اس بات پر مقرر کیا کہ وہ چھت پر سے پتھر کو لڑھکا کر سرکار کا خاتمہ کر دے، بروقت اللہ تعالیٰ نے سرکار کو باخبر کر کے آپ کی جان بچائی، کیا یہ دفعہ نمبر ایک کی خلاف ورزی نہیں ہے؟

یوں ہی دفعہ نمبر ۳ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قبیلہ بنو قریظہ نے عین غزوۂ احزاب کے وقت مسلمانوں کے خلاف لشکر کفار کی مدد کی اور انھوں نے باقاعدہ مدینہ پر حملے کی کوشش بھی کی، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ناکام کیا، ان کے ظلم کی انتہا اس وقت ہوگئی، جب

۱۔ ضیاء النبی: ۴۔

۲۔ تاریخ بنی اسرائیل فی اسفارھم، ص: ۵۵، ۴، منشورات المکتبۃ العصریۃ، بیروت: ۱۹۶۹۔

انھوں نے اس مکان پر حملے کی سازش رچ ڈالی، جہاں پر مسلمانوں کی عورتیں اور بچے محفوظ تھے، غزوۂ احزاب کی سنگینی کا اندازہ جس شخص کو ہے، اس کو معلوم ہوگا کہ بنو قریظہ کی یہ غداری کس قدر خطرناک اور پریشان کن تھی۔

اسی طرح قبیلۂ بنو نضیر کے چند یہودی خیبر میں جا کر مقیم ہوئے، کچھ دنوں کے بعد وہاں پر انھوں نے اپنے رئیس سلام بن مشکم کی صدارت میں ایک نشست کی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب معاہدہ کا کچھ مطلب نہیں ہم اپنی پوری طاقت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کریں، اور اس سلسلے میں استمداد کے لیے انھوں نے چودہ افراد پر مشتمل ایک وفد کنانہ بن ابی الحقیق کی قیادت میں غطفان پہونچا اور ان کو اس مہم میں شرکت کی دعوت دی اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ انھیں اس امداد کے عوض اپنے نخلستان کی نصف پیداوار کھجوریں دیں گے۔(۱)

یہ تاریخی شواہد اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے حتی الامکان یہود سے کئے گئے معاہدے کی پاس داری کی مگر خود یہود ہی نے اپنی شر پسندی سے اس کی خلاف ورزی کی، ایسے میں یہ کہنا کہ یہود سے کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کے ذمہ دار آپ ﷺ ہی تھے، صریح جھوٹ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

محترم قارئین کرام! اب تک ہم نے اخلاق نبوت کے چند پہلوؤں پر دریدہ دہن مستشرقین کے ہفوات کے جوابات آپ حضرات کے سامنے پیش کیے، اب آیئے خود مستشرقین کی زبانی اپنے آقا کے اخلاق کی ثناخوانی ملاحظہ فرماتے چلیں۔

منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

''اپنے زمانے میں محمد (ﷺ) ایک سماجی مصلح تھے اور آپ کی اصلاحات کا دائرہ اخلاقی پہلو کو بھی محیط تھا۔''(۲)

منٹگمری واٹ کا یہ نظریہ ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس نے سرکار ﷺ کو عہد شکن قرار دیا مگر اس کی لکھی ہوئی یہ تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''محمد نے ایک روحانی اور سماجی نظام قائم کیا جو آج کے ترقی یافتہ دنیا کے چھٹے حصے

۱۔ امتاع الاسماع: ۱/۲۳۶، مطبع سابق۔

۲۔ محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس مین، ص: ۲۳۴، مطبع سابق۔

کی رہنمائی کر رہا ہے، یہ کام کسی ڈھو کے باز یا عیاش شخص کا نہیں ہو سکتا۔"(۱)

ٹار انڈرائے جس نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے واقعے کو لے کر آپ کو عیار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس نے لکھا ہے کہ:

"اپنی ذات کا یہ اخلاقی شعور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کا جو مذہبی نمونہ کامل لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا، اس میں اور آپ کے ذاتی کردار میں تضاد نہ تھا۔"(۲)

ولیم میور نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کو ان الفاظ میں سلامی دی ہے:

"محمد معاملات میں راست باز اور انصاف پسند تھے، جب آپ کی عمر زیادہ ہوئی تو آپ کے شریفانہ طرز عمل کی وجہ سے قوم نے آپ کو 'امین' کا لقب دیا۔"(۳)

۱۔ محمد ایٹ مکہ، ص: ۳۳۲، مطبع سابق۔

۲۔ محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ، ص: ۱۸۰، مطبع سابق۔

۳۔ محمد اینڈ اسلام، ص: ۹، مطبع سابق۔

تعارف مصنف

پیش کش: غلام سید علی علیمی

نام: کمال احمد علیمی نظامی

ولدیت: شاہ محمد

نسب: کمال احمد بن شاہ محمد بن راج بہادر بن چھکان۔

تاریخ ولادت: ۱۰ر فروری ۱۹۸۵ء

جائے پیدائش و مستقل پتہ: مقام و پوسٹ رام نگر، ضلع بلرام پور، یوپی۔

سکونت: بچھیا گنج، حمد اشاہی، بستی، یوپی۔

ابتدائی تعلیم: مدرسہ عارف العلوم، رام نگر۔ پرائمری تک۔

متوسطات: دارالعلوم فضل رحمانیہ، پچپڑوا، دارالعلوم ہدایت الاسلام، بمہیاں، بلرام پور۔ منشی و مولوی تک۔

اعلیٰ تعلیم: دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی۔ عالمیت و فضیلت تک۔

اساتذہ:

☆ ماسٹر شہزاد، ماسٹر سعید، ماسٹر تیس صاحبان، اساتذہ عارف العلوم رام نگر۔

☆ مولانا منیر احمد، ماسٹر نیاز، اساتذہ فضل رحمانیہ۔

☆ حضرت علامہ محمد احمد صاحب، حضرت علامہ سعی محمد صاحب، حضرت ماسٹر اصغر علی صاحب وغیرہ۔

☆ حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی، سابق پرنسپل علیمیہ جمدا شاہی، حضرت علامہ محمد تفسیر القادری قیامی صاحب، قمر العلما حضرت علامہ محمد قمر عالم صاحب قادری، شیخ الحدیث علیمیہ جمدا شاہی، تاج الفقہا حضرت علامہ مفتی اختر حسین قادری، صدر دارالافتا علیمیہ جمدا

شاہی، حضرت علامہ امید علی صدیقی صاحب، حضرت علامہ مفتی نظام الدین صاحب، حضرت علامہ محب احمد علیمیؔ، حضرت ماسٹر سراج الدین صاحب، حضرت مولانا حافظ منصور عالم علیگؔ صاحب، حضرت قاری حبیب اللہ صاحب، حضرت علامہ ڈاکٹر انوار احمد خان بغدادی، حضرت علامہ شفیق الرحمٰن صاحب، حضرت علامہ معراج الحق بغدادی صاحب، حضرت مولانا حافظ وقاری نصیر احمد عزیزی۔

تعلیمی لیاقت: منشی، مولوی، عالم، فاضل ادب، فاضل دینیات، کامل عربی، کامل فارسی، مدرسہ تعلیمی بورڈ لکھنؤ، یوپی۔

عالمیت، قراءت، فضیلت، دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی۔ ادیب ماہر، ادیب کامل، جامعہ اردو، علی گڑھ۔

سند عالمیت، سند فضیلت، سند قراءت۔

اسانید: سند حدیث از علامہ فروغ احمد اعظمیؔ بروایت بحر العلوم مفتی عبدالمنان اعظمی علیہ الرحمہ، سند دیگر علوم اسلامیہ از فروغ احمد اعظمی بروایت شرف ملت علامہ عبدالحکیم شرف قادری، پاکستان۔

بیعت: خطیب البراہین، حضرت علامہ الشاہ صوفی محمد نظام الدین علیہ الرحمہ۔

خلافت: شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی کچھوچھوی مدظلہ العالی۔

اعزازات: علیمیؔ ایوارڈ (چار مرتبہ)، سند توصیف از امین ملت ڈاکٹر سید محمد امین میاں مارہروی، بموقع خطاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سند امتیاز از علامہ سید محمد اسید الحق قادری بدایوں شریف بموقع مسابقہ حدیث بدایوں شریف۔

تدریسی خدمات: فراغت کے بعد سے تاحال: دارالعلوم علیمیہ رنسواں جمدا شاہی بستی۔

مناصب: سرپرست جامعہ ام الخیر نسواں، نصیب گنج بستی، جنرل سکریٹری مدرسہ اہل سنت، پیڑا، بستی، نگراں مدرسہ عارف العلوم رام نگر، متعدد تنظیموں اور رفاہی اداروں کی نگرانی وسرپرستی۔

☆ مبلغ اسلام نمبر کی ترتیب (مطبوع) ☆ فتح المبین در رد غیر مقلدین کی تخریج و اشاعت ☆ تاج الشریعہ نمبر، مجموعہ مقالات طلبہ علمیہ کی ترتیب و تصحیح (مطبوع) ☆ خطیب البراہین نمبر کی اشاعت میں حصہ داری (مطبوع) ☆ اسلام سمجھو اور سمجھاؤ (مطبوع) ☆ قواعد عربی از علامہ محمد ایوب شریف القادری کی تحقیق و تخریج و تحشیہ (مطبوع) ☆ شرح ہدایۃ النحو از علامہ موصوف کی تحقیق، تخریج و تحشیہ (مطبوع) ☆ حیات شریف العلما (مطبوع) ☆ شیخ القرآن، حیات و خدمات (مطبوع) ☆ تحفہ رفاعیہ (مطبوع) ☆ معمار ملت حیات و خدمات (غیر مطبوع) ☆ عقاید اہل سنت (غیر مطبوع) ☆ الخواطر، عربی مقالات کا مجموعہ (غیر مطبوع) ☆ مقالات علمی، تین درجن سے زاید مقالات کا مجموعہ (غیر مطبوع) ☆ تجزیات، متعدد کتب پر لکھے گئے تبصروں کا مجموعہ (غیر مطبوع) ☆ قلادۃ الجواہر کا ترجمہ (غیر مطبوع) ☆ اصول الدعوۃ کی کچھ بحثوں کا ترجمہ (غیر مطبوع) ☆ حدوث الفتن کی کچھ بحثوں کا ترجمہ (غیر مطبوع) ☆ شمس العلما نمبر (زیر ترتیب) ☆ تفسیری شہ پارے از علامہ محمد ایوب شریف القادری (زیر تخریج و تحقیق) ☆ حیات شریف العلما حصہ دوم (قریب التکمیل) ☆ الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ پر طلبہ علمیہ کے ذریعے کیے جانے والے کام کی نگرانی۔

علمی و قلمی حصولیابیاں:

علاوہ ازیں بہت سارے مجلات و رسائل کی مجلس ادارت و مشاورت میں شمولیت۔ مبلغ اسلام سیمینار علیمیہ جمدا شاہی، سید العلما سیمینار مارہرہ شریف، فکر و تدبیر کانفرنس، مارہرہ شریف، بحر العلوم فرنگی محلی سیمینار، مشائخ چشت سیمینار، شیخ عبد الحق محدث دہلوی سیمینار زیر انتظام خانقاہ قادریہ ایوبیہ پرا کنک، کشی نگر اور متعدد سمپوزیم میں شرکت۔

اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن

حیدرآباد دکن

اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن
کی کچھ مطبوعات

کُتب امام ابن ابی دنیا (م: 281ھ):

1- ''اخلاص وحسن نیت'' (کتاب الإخلاص والنیة)؛ مترجم: مولانا حسان رضا مصباحی

2- ''رضا وقضا'' (الرضا عن اللہ بقضائہ)؛ مترجم: مولانا روشن رضا مصباحی۔

3- ''بردباری کی فضیلت'' (کتاب الحلم)؛ مترجم: مولانا ظہیر الدین مصباحی۔

کُتب امام سلمی شافعی (م: 412ھ):

1- ''اربعین تصوف'' (کتاب الاربعین فی التصوف)؛ مترجم: علامہ عبد المالک مصباحی

2- ''نفس کی برائیاں'' (عیوب النفس)؛ مترجم: مولانا سراج احمد قادری مصباحی۔

3- ''آداب زندگی'' (آداب الصحبہ وحسن العشرۃ)؛ مترجم: مولانا رئیس اختر مصباحی

کُتب امام ابن رجب حنبلی (م: 795ھ):

1- ''اہل شریعت وطریقت کی پہچان'' (کشف الکربۃ فی وصف اہل الغربۃ)؛ مترجم: مولانا مفتی عبد الخبیر اشرفی مصباحی۔

2- ''توحید اور کلمۂ اخلاص'' (تحقیق کلمۃ الاخلاص)؛ مترجم: مولانا حفیظ الرحمن مصباحی

3- ''حرص جاہ ومال'' (ذم المال والجاہ)؛ مترجم: مولانا آصف مصباحی۔

کتب امام ملا علی قاری حنفی (م: 1014ھ):

1- ''اربعین احادیث قدسی'' (الأحادیث القدسیة الأربعینیة)؛ مترجم: مولانا افضل حسین اشرفی مصباحی۔

2- ''حیات خضر علیہ السلام'' (الحذر فی امر الخضر)؛ مترجم: مولانا محمد گلریز رضا مصباحی۔

3- ''خوف خاتمہ'' (المقدمۃ السالمۃ فی خوف الخاتمۃ)؛ مترجم: مولانا رئیس اختر مصباحی

کُتب دیگر ائمہ:

1- ''ایمان کی شاخیں'' (شعب الایمان)۔ امام ابن کثیر؛ مترجم: ڈاکٹر حامد علی علیمی۔

2- ''بدفعلی کا وبال'' (ذم اللواط)۔ امام آجری؛ مترجم: مولانا سراج احمد قادری مصباحی